مارچ ۱۹۷۴ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

و قد اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین (القرآن)

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۲۱ | مارچ ۱۹۷۴ء | شمارہ ۳

فہرست مضامین

تذکرہ و تبصرہ	ڈاکٹر اسرار احمد	۱
مطالعۂ قرآن ● آیۃالکرسی	،،	۵
تدبر قرآن ● تفسیر سورہ کہف (۲)	مولانا امین احسن اصلاحی	۹
مقالات ● مولانا شبلی، مولانا آزاد، مولانا فراہی اور مولانا اصلاحی: ایک شخصیاتی موازانہ	ڈاکٹر اسرار احمد	۲۳
● مولانا فراہی کی علمی خدمات	جناب خالد مسعود	۲۷
● مولانا فراہی کے اصول تفسیر	محمود احمد لودھی	۳۷
خطوط و نکات ● تدبر قرآن کے ایک قاری کا تاثر	عبدالرشید عراقی	۴۸

* مدیر مسؤل *

ڈاکٹر اسرار احمد

ایم بی۔بی۔ایس (پنجاب) ۔ایم اے اسلامیات (کراچی)

* یکے از مطبوعات *

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۱۲۔ افغانی روڈ، سمن آباد، لاہور (فون : ۶۸۲۳۵)

چندہ سالانہ ۱۰/-

قیمت فی پرچہ ۱/-

قال

اللہ

تبارک وتعالیٰ

واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا

فرمایا اللہ تعالیٰ نے : (اے مسلمانو!) سب مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں مت پڑو۔

سورہ آل عمران ——— آیت ۱۰۳

وقال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وبارک وسلم

فی شان القرآن الکریم

ھو حبل اللہ المتین

اور فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کے بارے میں کہ "یہ ہے اللہ کی مضبوط رسی"

رواہ الترمذی والدارمی ——— عن علی رضی اللہ عنہ

من : جمعیۃ خدّام القرآن المرکزیۃ ○ بلاهور

فون ۶۸۲۴۵۱ مرکزی انجمن خدام القرآن : ۱۲ - افغانی روڈ - سمن آباد - لاہور فون ۶۸۲۳۵۱

یہ بلاک

عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس

منعقدہ لاہور: ۲۲ تا ۲۴ فروری ۱۹۷۴ء

کے موقع پر روز نامہ پاکستان ٹائمز میں روبی جیولرز کے تعاون سے اور روز نامہ نوائے وقت میں اظہار لمیٹڈ کے تعاون سے شائع کیا گیا۔

اسرار احمدؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

جمعہ ۲۲ فروری ۱۹۷۴ء کا دن اس اعتبار سے عرصہ دراز تک یاد رہے گا کہ اس دن جملہ مسلمانانِ پاکستان کو بالعموم اور "زندہ دلانِ لاہور" کو بالخصوص ایک طرف حد درجہ مسرت و فرحت اور انتہائی نشاط و انبساط کا احساس ہوا تو دوسری طرف اسی قدر شدید رنج و غم اور اتنی ہی سخت افسردگی اور مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

یوں تو انسانی زندگی میں مسرت و شادمانی اور رنج و غم کچھ لازم و ملزوم ہی سے ہیں اور زندگی کا سفر مستقلاً اسی کیفیت میں گزرتا ہے کہ ع "چند کلیاں نشاط کی چن کر مدتوں محوِ یاس رہتا ہوں!" تاہم اکثر و بیشتر ہوتا یہ ہے کہ ایک مسرت بخش واقعہ پیش آیا، خوشی حاصل ہوئی وہ تدریجاً اپنی انتہا کو پہنچی۔ پھر فطری طور پر اس کے احساس کی شدت میں کمی ہونی شروع ہوئی اور جب اس کے اثرات بالکل زائل ہو گئے تو یا تو کوئی نیا رنجدہ واقعہ پیش آ گیا یا کوئی پرانا غم جاگ اٹھا اور کسی نیم مندمل شدہ زخم میں درد کی ٹیسیں اٹھنی شروع ہو گئیں اور اس طرح خوشی اور غم اور راحت و الم کے دور آتے رہے اور زندگی اپنی منزلیں طے کرتی گئی۔

جو کچھ ۲۲ فروری کو ہوا یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اتفاقاً ہو گیا یا جان بوجھ کر ایک طے شدہ پروگرام کے تحت کیا گیا، بہرحال حقائق اس کے بالکل برعکس! یعنی یہ کہ خوشی اور مسرت اور راحت و شادمانی کے احساسات تدریجاً ترقی کرتے ہوئے جیسے ہی اپنے نقطۂ عروج (CLIMAX) کو پہنچے، فوراً ہی غم اپنی پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہو گیا اور دفعتہً رنج و الم کا ایک مہیب پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بعض دوسرے معاملات میں تو فوری تقابل اور اجتماعِ ضدین (SIMULTANEOUS CONTRAST) کا تجربہ اس سے پہلے بھی ہوا ہے لیکن خوشی اور غم، مسرت اور رنج اور راحت و الم کا اس قدر شدید اور اتنا فوری و بیک وقت اجتماع کم از کم راقم کی یادداشت کے ذخیرے میں موجود نہیں!

اس کا ایک فائدہ البتہ ہوا، جسے اگر یہ سب کچھ از خود ہوا تو رحمتِ خداوندی سے تعبیر کرنا چاہیئے اور اگر یہ جان بوجھ کر کیا گیا تو کسی کے تدبر اور حکمتِ عملی کا شاہکار قرار دیا جانا چاہیئے۔ یعنی یہ کہ

نتیجۃً مسرت و غم اور راحت و الم کے احساسات کچھ اس طرح مل جل بلکہ گھل مل سے گئے کہ اکثر و بیشتر لوگ کچھ کھوئے سے تو رہے لیکن متعیّن طور پر خود بھی طے نہ کر پائے کہ انہیں خوشی زیادہ ہے یا غم! یا دونوں کے حاصلِ ضرب میں غلبہ مثبت فرحت و مسرت کو ہے یا منفی رنج و الم کو!

"عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس" کا پاکستان کے دل یعنی ارضِ لاہور میں انعقاد یقیناً ایک حد درجہ نشاط انگیز، وجد آگیں اور کیف آور واقعہ تھا۔ جیسے جیسے اس کے دن قریب آتے گئے اور خصوصاً اہلِ لاہور کی نگاہوں کے سامنے اس کے اہتمام کے مراحل طے ہوتے گئے دلوں کی کلیاں چٹکنی شروع ہو گئیں، احساس کی افسردہ زمین سے مسرت کے سوتے پھوٹنے شروع ہو گئے، دُکھ درد کا احساس ماند پڑتا گیا اور انشراح و انبساط کی ایک کیفیت رفتہ رفتہ قلوب کی دنیا پر طاری ہوتی چلی گئی۔ ملت کے اجتماعی شعور نے کچھ ایسے محسوس کیا جیسے کم و بیش ایک صدی کے دوران متعدد بار دیکھے گئے، خواب کی تعبیر قریب آ رہی ہے چنانچہ اجتماعی یادداشت کے ذخیرے سے کبھی جمال الدین افغانی کا ہیولیٰ ابھرتا تھا کبھی تحریکِ خلافت کی یادیں تازہ ہوتی تھیں اور کبھی قافلۂ ملّی کے اس آخری حُدی خواں کی شخصیت ابھر کر سامنے آتی تھی جو اسی ارضِ لاہور میں خوابیدہ ہے۔

۲۲ فروری ۱۹۷۴ء کو روئے ارضی کی وسیع ترین مسجد میں کرۂ ارضی کے کم و بیش تین درجن مسلمان ممالک کے سربراہوں یا نمائندوں کا اجتماع یقیناً اس خوشی اور مسرت و انبساط کا نقطۂ عروج تھا! ہر اس مسلمان کی فرحت و شادمانی انتہائی بلندیوں کو چھو رہی تھی جس کے دل کی کسی دُور دراز گہرائی میں جذبۂ ملّی کی کوئی چنگاری خواہ امتدادِ زمانہ کی خاکستر اور تلخ حالات و واقعات کی راکھ کی دبیز تہوں میں دبی ہوئی ہی سہی بہرحال کسی درجے میں سلگتی ہوئی موجود تھی۔ خصوصاً اہلِ لاہور کے دل تو بلیوں اچھل رہے تھے! اور ان کا جوش و خروش انتہا کو پہنچا ہوا تھا ——— کہ دفعۃً غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ٹیلی ویژن کے ناظرین نے دیکھا اور ریڈیو کے سامعین نے سنا کہ وزیرِ اعظم بھٹو نے گورنروں، وزرائے اعلیٰ اور ممبرانِ سینیٹ و اسمبلی کے مشترکہ اجتماع میں "بنگلہ دیش" کی "تلخ حقیقت" کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا! جوش و خروش ایک دم ختم ہو گیا، جذبات سرد پڑ گئے، خوشی کی جگہ غم نے لے لی۔ صبحِ امید کی بجائے شامِ یاس کا سا منظر چھا گیا، اور فی الجملہ ایک سکتے کا سا عالم طاری ہو گیا ——— ! اور یہ کیفیت اس درجہ محیط و ہمہ گیر تھی کہ وہ لوگ بھی اس کے تسلط سے بچ نہ پائے جو خود "بنگلہ دیش" کی "تلخ حقیقت" کو تسلیم کرنے کے پُرزور حامی تھے!

بعد میں ——— کانفرنس کی دو روزہ کارروائی کے دوران، جیسا کہ سب کو معلوم ہے، خوشی اور غم کا احساس ملا جلا سا رہا، اور ہر صاحبِ احساس کے قلب کی گہرائیوں میں راحت و کلفت اور امید و بیم کی کیفیات گھلی ملی سی رہیں؛ یہاں تک کہ آخری وقت تک اگر خوشی غم پر غالب نہ آ سکی تو غم بھی خوشی کو بالکلیہ زائل نہ کر پایا ——— اور یہ معاملہ یقیناً بہت غنیمت رہا؛ ورنہ غالباً یہ غم سہا نہ جا سکتا اور کوئی شدید جذباتی ردِ عمل ایک آتش فشاں کے مانند پھٹ پڑتا اور پھر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ مسئلہ کہاں جا کر ختم ہوتا!

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بنگلہ دیش کے تسلیم کرنے پر شدید غم و غصہ اور عالمی اسلامی کانفرنس کے انعقاد پر اتنی ہی مسرت و خوشی نرے سطحی اور جذباتی احساسات نہیں ہیں بلکہ ان دونوں کا گہرا تعلق اس تحریک سے ہے جس کا ایک اہم مظہر قیامِ پاکستان تھا۔ چنانچہ جہاں بنگلہ دیش کا قیام اور اب اس کا پاکستان کی جانب سے تسلیم کر لیا جانا ایک پہلو سے اس تحریک کی ہزیمت اور پسپائی کی علامت ہے وہاں لاہور کانفرنس کا انعقاد اس تحریک کی شاندار پیش قدمی کا نشان اور "ع" ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا!" کا اعلان ہے۔

بنگلہ دیش کے بارے میں فروری ۷۲ء کے 'میثاق' میں ہم نے تفصیل سے عرض کیا تھا کہ ہمارے نزدیک جغرافیائی حقائق کو بالکل نظر انداز کر کے ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے مشرقی اور مغربی خطوں کو ایک مملکت کے بندھن میں باندھ دینا اگرچہ حد درجہ نیک نیتی سے ہوا تاہم تھا ایک غلط اقدام جس کی تصحیح اگر ہم سیاسی اعتبار سے ایک باشعور قوم ہوتے تو بخوبی کر لیتے۔ لیکن چونکہ معاملہ بالکل برعکس تھا لہٰذا ع "ہر چہ دانا کند، کند ناداں، لیک بعد از خرابیٔ بسیار!" کے مصداق وہ تصحیح (RECTIFICATION) ہو کر تو رہی اگرچہ نہایت جلدے اور بھونڈے طریق پر اور سخت تکلیف دہ انداز میں! ——— اور اب مصلحت کا تقاضہ یہی تھا کہ اس تلخ حقیقت کو "تسلیم" کرنے کا کڑوا گھونٹ بھی بھر ہی لیا جاتا۔ اس لئے کہ اب اس کے سوا اور کوئی صورت بنگلہ دیش کو بھارت کے حلقہ اثر سے کسی نہ کسی درجے میں نکالنے کی موجود نہیں ——— بلکہ ہم اس مرحلہ پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ کم از کم ظاہری صورت یہ بنی کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا یہ اقدام نہ بھارت کے دباؤ سے ہوا نہ کسی اور عالمی طاقت کے زیر اثر۔ بلکہ ہمیں یہ قدم بعض مسلمان ممالک کے محبت بھرے اور خلوص آمیز اصرار پر اٹھانا پڑا۔

بہرنوع، یہ تلخ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ تحریک پاکستان کے اعتبار سے یہ ایک ہزیمت اور پسپائی

بہار جائے کتنا ہی فرقتی ہو اور کیسا ہی جزوی !

اس کے بالکل برعکس، لاہور کانفرنس کا انعقاد اگرچہ اس کے بہت سے دوسرے فوری، سیاسی اور معاشی عوامل بھی یقینا موجود ہیں اور اس سے کسی بڑے ڈرامائی نتیجے کی توقع بھی عبث ہے تاہم یہ اسی تحریک تجدید دین کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کا ایسا اہم مظہر قیام پاکستان تھا۔ اس لئے کہ جس طرح تحریک پاکستان کے عوامل بھی بہت سے تھے اور یہ کہنا غلط نہیں کہ اس کا اصل محرک مذہبی جذبہ نہیں تھا بلکہ اصلاً اس کی پشت پر بہت سے قومی و معاشی مسائل تھے۔ لیکن آخری تجزیے میں یہ حقیقت سامنے آتی تھی کہ اس قوم کی قومیت کی اساس بہرحال مذہب ہی ہے جس کے معاشی مفادات کا تحفظ پیش نظر ہے۔ اسی طرح اس کانفرنس میں شرکت کی بنا بہرحال اسلام اور صرف اسلام تھی۔ اور مشرق بعید سے لے کر مغرب اقصیٰ تک کے زرد رو، گندمی، سانولے اور سیاہ فام لوگوں کا ایک شہر میں جمع ہونا تھا بہرحال صرف مذہب کی بنیاد پر ——— اور اس کانفرنس کا اسی شہر میں منعقد ہونا جہاں مصوّر پاکستان، اور قائد ملّی کا عظیم حدی خوان خوابیدہ ہے اور "قرارداد لاہور" کے کم و بیش چونتیس سال بعد ایک وسیع تر سطح پر عالمی ملت اسلامیہ کے اتحاد کا نعرہ اسی ارضِ لاہور سے بلند ہونا یقیناً بہت معنی خیز (SIGNIFICANT) ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے اثرات و نتائج کے ظہور میں وقت لگے اور یہ وقت بھی خدائی تقویم کے مطابق ہو !!

حواشی

لہ کُلُّ مَا فِي الْكَوْنِ وَهْمٌ أَوْ خَيَال
أَوْ عُكُوسٌ فِي الْمَرَايَا أَوْ ظِلَال!

لہ ١- صحیح مسلم میں حضرت ابیّ ابن کعبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا "اے ابوالمنذر تم جانتے ہو کہ کتاب اللہ کی کون سی آیت سب سے عظمت والی ہے؟" میں نے عرض کیا "اللہ اور اس کے رسولؐ کو زیادہ علم ہے" اس پر آپؐ نے مکرر فرمایا "اے ابوالمنذر تم جانتے ہو کہ کتاب اللہ کی کون سی آیت تمہارے پاس سب سے زیادہ عظمت والی ہے؟" تب میں نے عرض کیا "اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ..." تو آپ نے میرا سینہ ٹھونکا (گویا شاباش دی) اور فرمایا "اے ابوالمنذر تجھے یہ علم موافق آئے اور مبارک ہو!"

٢- ترمذی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ہر چیز کی ایک چوٹی ہوتی ہے تو قرآن کی چوٹی سورۃ بقرہ ہے اور اس میں ایک آیت (یعنی آیۃ الکرسی) تمام آیات قرآنی کی سردار ہے!"

مطالعہ قرآن
اسرار احمد

آیۃ الکرسی

ایک نشری تقریر: بعض اضافوں کے ساتھ

متعدد روایات[1] کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیۃ الکرسی کو قرآن حکیم کی عظیم ترین آیت قرار دیا ہے اور سورۂ اخلاص کو عظیم ترین سورت اور عجب حسنِ اتفاق ہے کہ آیت الکرسی قرآن مجید کی طویل ترین آیات میں سے ہے اور سورہ اخلاص مختصر ترین سورتوں میں سے!

ان دونوں کی عظمت کی یہ مشترک اساس تو اظہر من الشمس ہے کہ دونوں میں توحید باری تعالیٰ کا بیان نہایت پُرشکوہ انداز میں ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ توحید ہی دینِ حق کا اصل الاصول ہے۔ البتہ یہ حقیقت ذرا غور کرنے ہی سے معلوم ہوتی ہے کہ ان دو مقامات پر عقیدۂ توحید کے دو مختلف پہلوؤں کی وضاحت ہوئی ہے اور ان دونوں کو اپنی اپنی جگہ توحید کے اس خاص پہلو کے جامع و مانع بیان کے ضمن میں پورے قرآن میں منفرد مقام حاصل ہے۔

چنانچہ جہاں سورۂ اخلاص حضرتِ حق سبحانہٗ کی شانِ احدیت و صمدیت کے پُرشکوہ اثبات اور کسی کے کسی بھی اعتبار سے اس کے ہم پلّہ، ہم جنس یا ہم کفو ہونے کی ہمہ جہتی نفی سے شرک فی الذات کا کامل سدّباب کر دیتی ہے وہاں آیت الکرسی میں ذاتِ واجب الوجود کی صفاتِ کاملہ کا بیان ایسے پُرجلال اور پُرہیبت انداز میں ہوا ہے جس سے نہ صرف یہ کہ شرک فی الصفات کی جڑ کٹ جاتی ہے، بلکہ شرک فی العبادت کی راہ بھی کلیتہً مسدود ہو جاتی ہے۔

---

[1] مثلاً مسند دارمی میں حضرت ایفع ابن عبدالکلاعی سے روایت ہے کہ:

قَالَ رَجُلٌ یَا رَسُولَ اللّٰہِ اَیُّ سُورَۃِ الْقُرْآنِ اَعْظَمُ؟ قَالَ: "قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ" قَالَ: "فَاَیُّ آیَۃٍ فِی الْقُرْآنِ اَعْظَمُ؟ قَالَ: "آیَۃُ الْکُرْسِیِّ ..."

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: "یا رسول اللہ! قرآن کی عظیم ترین سورت کون سی ہے؟" آپؐ نے فرمایا "قل ھو اللہ احد!" اس نے پھر عرض کیا "اور آیتوں میں سب سے زیادہ عظمت والی آیت کون سی ہے؟" حضورؐ نے فرمایا: "آیت الکرسی ..."

یہ آیہ مبارکہ دس مستقل جملوں پر مشتمل ہے :

پہلا جملہ ـــــ یعنی " اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ " غیر اللہ سے صفت الوہیت کی کامل نفی کر دیتا ہے اور اس حقیقت کی وضاحت سے کہ اللہ ہی تنہا معبودِ برحق، مطلوب اصل اور محبوبِ حقیقی ہے شرک فی العبادت کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ اس کا عام فہم مطلب یہی ہے کہ اللہ کے سوا معبودِ حقیقی کوئی نہیں تاہم عارفین کے نزدیک اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ اللہ ہی تنہا محبوب حقیقی بھی ہے اور مطلوب و مقصودِ اصلی بھی !

دوسرا جملہ ـــــ ذاتِ حق سبحانہٗ و تعالیٰ کے ان دو عظیم اسماء پر مشتمل ہے جن کے بارے میں بعض روایات[1] کی بنا پر گمان غالب ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے " اسم اعظم " کی حیثیت حاصل ہے ۔ یعنی ' اَلْحَیّ ' اور ' اَلْقَیُّوْم '

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں اسمائے حسنیٰ میں وہی باہمی تعلق ہے جو ' اَلْاَحَد ' اور ' اَلصَّمَد ' میں۔ گویا جیسے توحید ذاتی کے بیان میں اللہ تعالیٰ کی شان احدیت کی نسبت تمام تر اپنی

---

[1] مثلاً مسند امام احمد میں حضرت اسماء بنت یزید سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں :

" سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ فِیْ ھَاتَیْنِ الْاٰیَتَیْنِ : اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ، اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ اِنَّ فِیْھِمَا اِسْمُ اللّٰہِ الْاَعْظَمُ "	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دو آیتوں کے بارے میں یعنی ایک آیت الکرسی اور دوسری آل عمران کی پہلی آیت یہ فرماتے سنا کہ ان میں اللہ کا اسم اعظم ہے !

اس کی ہم مضمون روایات ترمذی، ابن ماجہ اور ابوداؤد میں بھی موجود ہیں (بحوالہ تفسیر ابن کثیرؒ) ـــــ اور ایک دوسری حدیث میں حضرت ابوامامہؓ مرفوعاً نقل فرماتے ہیں کہ : اللہ تعالیٰ کا وہ اسم اعظم جس کے واسطے سے دعا مانگی جائے تو ضرور قبول ہوتی ہے۔ تین سورتوں میں ہے سورۂ بقرہ میں، سورۂ آل عمران میں اور سورہ طٰہٰ میں" علما کے نزدیک سورہ بقرہ اور آل عمران کی آیات تو وہی ہیں جو پہلی حدیث میں بیان ہوئیں اور سورہ طٰہٰ کی آیت ہے " وَعَنَتِ الْوُجُوْہُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ " اور ان تینوں آیات میں جو اسمائے حسنیٰ مشترک ہیں وہ الحیّ اور القیوم ہی ہیں !

ذات ہی کی جانب ہے جبکہ اس کی شانِ صمدیت کا اظہار مخلوق کی نسبت سے ہوتا ہے اسی طرح توحیدِ صفاتی کے ضمن میں خدا خود اپنی ذات میں تو "الحیّ" ہے یعنی زندۂ جاوید اور از خود و باخود قائم و دائم اور ماسوٰی کے لئے "القیوم" ہے یعنی ان کے وجود کا واحد سبب اور ان کے قیام اور بقار کا واحد سہارا۔ گویا کہ اُسی کا وجود بھی خانہ ساز اور حیات بھی ذاتی اور ماسوٰی کا وجود بھی خالص عطائی اور حیات بھی نری مستعار!

تیسرے جملے —— یعنی لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ میں اللہ کی صفت حیات کے کامل ہونے کی تصریح ہے۔ یعنی اس کی حیات ہر ضعف و احتیاج سے مستغنی ہے۔ چنانچہ نہ اسے نیند آتی ہے نہ اونگھ۔ اس میں ایک مزید لطیف اشارہ ہو گیا اس حقیقت کی جانب کہ اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتی ہونے کے علاوہ کامل بھی ہیں اور مطلق بھی، جبکہ ماسوٰی کی صفات وہبی اور عطائی ہونے کے ساتھ ساتھ ناقص بھی ہیں اور مقیّد بھی!

چوتھا جملہ —— اللہ کی شانِ قیومی کے لازمی منطقی نتیجے کی وضاحت پر مشتمل ہے یعنی جب جملہ موجودات کا عینِ وجود ہی اسی کی توجہ کا مرہونِ منت ہے اور ان کے بقار و قیام کا پورا دار و مدار ہی اس کی نگاہِ کرم پر ہے تو لازماً یہ سلسلۂ کون و مکان کُل کا کُل اسی کی ملکیت ہے اور اسے ہی اس میں تصرف کا کامل اختیار حاصل ہے گویا "لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ" کے جامع الفاظ میں اللہ تعالیٰ کے "مَالِكُ الْمُلْكِ" ہونے کا بیان بھی ہے اور "اَلْمَلِكُ الْحَقُّ" ہونے کا اعلان بھی —— یعنی بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری!

پانچواں جملہ —— یعنی "مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ" یعنی کون ہے وہ جو سفارش کر سکے اس کے سامنے بغیر اس کی اجازت کے؟ شفاعتِ باطلہ کے عقیدے کی جڑ کاٹ دیتا ہے اور اس سے جہاں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ شفاعت ایک خالص عطائی اعزاز (BESTOWED HONOUR) ہے نہ کہ کسی کا ملکۂ نفسی یا استحقاقِ ذاتی، وہاں اُس شرک فی العبادت کی راہ بھی مسدود ہو جاتی ہے جو "هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ" کے بے بنیاد عقیدے کے تحت کیا جاتا ہے: یہی وجہ ہے کہ اس مقام پہ انداز بیاں حد درجہ پُر ہیبت اور پُر جلال ہی نہیں، قدرے غیظ آمیز اور غضب ناک بھی ہے!

اللہ تعالیٰ کی شان الوہیت و قیومیت کے بیان اور اس کی صفات جلیلہ میں سے وجودِ واجب، حیات کاملہ، قدرت مطلقہ، ملکیت تامہ اور اختیار کلی کی بالواسطہ تصریح یا براہ راست وضاحت کے بعد چھٹے اور ساتویں جملوں میں خالق اور مخلوق کے علم کے تقابل سے واضح کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا علم ذاتی بھی ہے اور کامل بھی، چنانچہ "مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ" کو بھی محیط ہے اور "وَمَا خَلْفَهُمْ" کو بھی جبکہ ماسوٰی کا علم ناقص اور محدود بھی ہے اور خالص وہبی اور عطائی بھی۔ چنانچہ چاہے جنّ ہوں یا انسان، اور خواہ اولیا و انبیاء ہوں یا ملائکہ و ارواح کسی کے پاس اپنا ذاتی علم کوئی نہیں، جو کچھ ہے صرف اللہ کی عطا اور اسؔ کی دین، اور بس اسی قدر ہے جس قدر وہ چاہے اور عطا فرماوے " وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۤءَ"

آٹھویں اور نویں جملوں میں خدا کے غلبہ و اقتدار کی وسعت اور اس کے قبضہ و اختیار کی ہمہ گیری کی ایک جھلک نہایت پُرشکوہ الفاظ میں دکھا دی گئی ہے یعنی آسمانوں اور زمین کی تمام وسعتیں اسیؔ کے حیطہ اقتدار میں ہیں اور پورا سلسلہ کون و مکاں اسیؔ کے زیر نگیں ہے اور وہؔ اس مملکت بے کراں کے حفظ و امان اور اس سلطنت بے پایاں کے انتظام و انصرام سے ہرگز کسی درجے میں بھی عاجز اور لاچار نہیں!

آخری جملہ پھر دو عظیم اسمائے حسنیٰ پر مشتمل ہے جو "وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا" کی عظیم حقیقت پر آخری مہرِ تصدیق کے طور پر ثبت ہیں یعنی "وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ" یعنی وہؔ بلند و بالا بھی ہے اور بزرگ و برتر بھی اور صاحب عظمت و سطوت بھی ہے اور حامل شان و شوکت بھی۔

گویا اس آیہ کریمہ میں ذات واجب الوجود کی صفاتِ جلیلہ میں سے قدرت مطلقہ اور اختیار کامل پر حد درجہ زور دینے کے علاوہ دو اہم صفات یعنی حیات اور علم کے حوالے سے یہ بنیادی حقیقت واضح کر دی گئی کہ حضرت حق سبحانہٗ کی صفات اس کے وجود ہی کی طرح ذاتی بھی ہیں اور غیر محدود و لامتناہی بھی جبکہ ماسوٰی کی صفات ان کے عین وجود کے مانند خالص عطائی بھی ہیں اور نہ ہی محدود اور مقید بھی۔ گویا اسؔ کا وجود بھی حق اور صفات بھی حقیقی، اور ہمارا وجود بھی محض وہبی اور صفات بھی نری اعتباری!

اس طرح قرآن حکیم کی یہ آیت عظیمہ وجود، حیات، قدرت اور علم ایسی بنیادی صفات کے ضمن میں ذات باری تعالیٰ کی شان یکتائی کے بیان میں منفرد مقام کی حامل ہے اور یہی وجہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قرآن حکیم کی عظیم ترین آیت بھی قرار دیا ہے اور جملہ آیات قرآنی کی سردار بھیؔ!

تدبر قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ کہف (۲)

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا :

صیغہ واحد کا خطاب گروہ سے ہے

"حَسِبْتَ" کا خطاب ضروری نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہو بلکہ "اَلَمْ تَرَ" کے خطاب کی طرح یہ عام بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح کے خطاب میں جیسا کہ ہم پیچھے اپنی اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں ذکر کر چکے ہیں، مخاطب گروہ کا ایک ایک شخص فرداً فرداً مراد ہوتا ہے اور جمع کے خطاب کے بالمقابل اس میں زیادہ زور ہوتا ہے۔ خود اسی سلسلہ کلام میں آگے متعدد خطابات بصیغہ واحد ہیں۔ لیکن ان سب میں خطاب آنحضرتؐ سے نہیں بلکہ مخاطب گروہ سے ہے مثلاً "وتری الشمس" آیت ۱۷، "وتحسبھم"، "لو اطلعت"، "لولیت"، "ولملئت" آیت ۱۸

یہ خطاب سوال کرنے والوں سے ہے

یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ آنحضرت صلعم کو خطاب کر کے یہ فرمانے کا کیا محل ہے کہ "کیا تم اصحاب کہف و رقیم کو ہماری نشانیوں میں سے کچھ عجیب چیز خیال کرتے ہو؟" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اوّل تو اس سرگزشت سے واقف ہی نہیں تھے۔ اوّل اوّل آپ اس وحی کے ذریعہ ہی سے اس سے واقف ہوئے اور بالفرض آپ کچھ واقف رہے بھی ہوں تو اس میں آپؐ کے لئے تعجب اور حیرت کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے! اس سے کہیں زیادہ عجیب سرگزشتیں آپ کو سابق انبیائے کرام کی سنائی جا چکی تھیں۔ پھر آپؐ کے اصحاب کہف کے معاملہ کو عجیب اور نادر سمجھنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی! ہمارے نزدیک یہ خطاب سوال کرنے والوں سے ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ سوال اٹھایا ان کے پیش نظر اصل مقصد یہ تھا کہ لوگوں کی نظر میں آنحضرتؐ اور آپ کے صحابہ رضؓ کی وقعت گھٹائیں کہ ہمارے ہاں تو اصحاب الکہف جیسے اولیائے کبار گزرے ہیں جن کے لئے خدا کی قدرت کی نہایت عظیم

نشانیں ظاہر ہوئیں تو ہم کسی اور کی ہدایت و رہنمائی کے محتاج کب ہوسکتے ہیں اور وہ بھی ایک ایسے نبی کی ہدایت کے جس کے اندر ہم اس طرح کی کوئی بات بھی نہیں پا رہے ہیں۔ یہ بات یہاں پیش نظر رہے کہ اس دور میں یہود و نصاریٰ دونوں کھلم کھلا یہ بات کہنے لگے تھے کہ جس کو ہدایت کی طلب ہو وہ یہودی بنے یا نصرانی۔ یہ نیا دین چلایا گیا ہے، اس سے بہتر تو مشرکین ہی کا دین ہے! سوال اٹھانے والوں کی اس پس پردہ ذہنیت کو سامنے رکھ کر قرآن نے جواب کا آغاز ہی اس بات سے کیا کہ اگر تم اصحاب کہف کے ماجرے کو بہت عجیب چیز سمجھتے ہو تو یہ بہت عجیب چیز نہیں ہے۔ یہ خدا کی بے شمار نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ اس طرح کی نشانیاں پہلے بھی ظاہر ہوتی ہیں اور آئندہ بھی یہ ان لوگوں کے لئے ظاہر ہوں گی جن کے لئے خدا چاہے گا۔ یہ نشانیاں خدا کے اختیار میں ہیں، ان پر کسی خاص گروہ کا اجارہ نہیں ہے۔

آیت کے خطاب کے معاملے میں ہماری رائے یہی ہے لیکن کوئی شخص اس کا مخاطب آنحضرت صلعم ہی کو قرار دینا چاہے تو اس صورت میں آیت کی تاویل یہ ہوگی کہ اگر تم معروف روایات کی بنا پر اصحاب کہف کے ماجرے کو عجیب سمجھتے ہو تو یہ کوئی عجیب چیز نہیں۔ خدا کی اس طرح کی نشانیاں پہلے بھی ظاہر ہوئی ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہوں گی۔ اس میں گویا آنحضرتؐ اور آپ کے صحابہؓ کے لئے بشارت ہے کہ جس طرح خدا نے پہلے اپنے دین کے علمبرداروں کی حفاظت کے لئے اپنی قدرت کی شانیں ظاہر کی ہیں اسی طرح تمہارے لئے بھی ہر مرحلہ میں اس کی شانیں ظاہر ہوں گی۔

اصحاب کہف و رقیم کی وجہ تسمیہ

رہا یہ سوال کہ ان لوگوں کو اصحاب کہف و رقیم کیوں کہا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ عرب کے اہل کتاب میں یہ لوگ اسی لقب سے معروف تھے۔ 'کہف' کی طرف ان کی نسبت تو ظاہر ہے کہ غار میں پناہ لینے کی وجہ سے ہوئی۔ رہا 'رقیم' تو اس کے بارے میں ہمارے نزدیک راجح قول وہ ہے جس کی روایت عکرمہ نے حضرت ابن عباسؓ سے کی ہے کہ حضرت کعبؓ کا خیال تھا کہ رقیم اس بستی کا نام تھا، جس سے نکل کر اصحاب کہف نے غار میں پناہ لی۔ رقیم وادی کو بھی کہتے ہیں۔ ناموں کے بارے میں یہ تحقیق کہ ان کا اصل کیا ہے غیر ضروری بھی ہے اور نہایت مشکل بھی۔ عجمی نام عربی کے قالب میں آ کر اس قدر بدل جاتے ہیں کہ ان کی اصل کی تحقیق کوہ کنی کے مترادف بن جاتی ہے اور مقصد تعلیم کے پہلو سے اس کی کوئی خاص اہمیت بھی نہیں۔ اگر یہ نام قرآن نے رکھا ہوتا تب تو اس کے معنی اور اس کی اصل کی جستجو کی ایک خاص اہمیت تھی، لیکن یہ نام، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، عرب کے اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ کا اختیار کردہ ہے۔ قرآن نے اسی کو اختیار کر لیا ہے۔ دور حاضر کے بعض محققین کی رائے میں رقیم وہی شہر ہے

جسے پیٹرا کے نام سے شہرت ملی اور عرب اسے بطرا کے نام سے جانتے ہیں۔

إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا آتِنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا۔

'رَشِدَ رَشَدًا' کے معنی ہیں اس نے ہدایت اور استقامت پائی۔ 'رَشِدَ أَمْرَهُ' کے معنی ہوں گے اس نے اپنے معاملے میں ہدایت پائی 'وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا' کا مفہوم ہوگا کہ اے ہمارے رب ہمارے لئے اس راہ میں جو ہم نے اختیار کی ہے تو رہنمائی اور استقامت کا یار رقم مہیا فرما۔

نوجوانوں کی دعا

یہ وہ دعا ہے جو ان نوجوانوں نے اس وقت کی ہے جب انہوں نے غار میں پناہ لینے کا ارادہ کیا ہے۔ آیت کے الفاظ سے یہ بات واضح ہے کہ یہ نوجوان لوگ تھے۔ نوجوانوں میں جب ایک مرتبہ حق کی حمیت جاگ پڑتی ہے تو پھر وہ نہ مصالح کی پروا کرتی اور نہ خطرات کی۔ لیکن ان لوگوں کے اندر صرف جوانی کا جوش ہی نہیں تھا بلکہ اللہ کی بخشی ہوئی حکمت کا نور بھی تھا۔ اس وجہ سے اس نازک مرحلہ میں انہوں نے اللہ سے رہنمائی اور استقامت کی دعا کی اور یہی بات اہل ایمان کے شایان شان ہے۔

سرگزشت کا خلاصہ بطور تمہید

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ آیت اور اس کے بعد کی دو آیتیں اصل سرگزشت کی تمہید کے طور پر ہیں جن میں پہلے اجمال کے ساتھ سرگزشت قاری کے سامنے رکھ دی گئی ہے۔ اس کے بعد پوری سرگزشت تفصیل کے ساتھ سامنے آئے گی۔ تفصیل سے پہلے اجمال کا یہ طریقہ اختیار کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اصل مدعا نگاہ کے سامنے رہتا ہے، دوسری ضمنی باتیں اس کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں۔

ضرب علی الآذان کا مفہوم

'فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا'۔ 'ضرب علی الآذان' کے لفظی معنی کانوں پر ہتھپڑ لگانے یا تھپکنے کے ہیں۔ یہیں سے یہ محاورہ کسی کو سننے سے روک دینے یا پیار و شفقت سے سلا دینے کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے کو جب سلاتے ہیں تو اس کے کانوں پر تھپکتے ہیں۔ غار میں پناہ لینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ ان پر کئی سالوں کے لئے نہایت آرام و سکون کی نیند طاری کر دی۔ نیند کے لئے یہ الفاظ بطور استعارہ استعمال ہوتے ہیں اور پیار کے ساتھ سلانے کے لئے یہ نہایت بلیغ استعارہ ہے۔

بیداری زندگی کا ایک عکس

ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصَىٰ لِمَا لَبِثُوا أَمَدًا۔ 'لِنَعْلَمَ' پر 'ل' غایت و نہایت کے مفہوم میں ہے اور 'نعلم' کے معنی یہاں دیکھنے اور جانچنے کے ہیں۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اس طویل نیند کے بعد پھر ہم نے ان کو جگایا تاکہ یہ بات اس نتیجہ تک منتہی ہو کر رہ دو

گروہ ہوکر آپس میں اس سوال پہ بحث کریں کہ اس حالت خواب میں وہ کتنی مدّت رہے ؟ کوئی کچھ کہے گا کوئی کچھ۔ اس طرح ہم ان کو جانچ لیں کہ اس مدّت کا ان میں سے کون گروہ اندازہ کر سکا اور بالآخر یہ بات واضح ہو جائے کہ ان میں سے کوئی بھی اس کا اندازہ نہ کر سکا۔ نیز ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ یہی حال برزخی زندگی کا ہوگا۔ اس کی مدّت کا بھی کسی کو احساس نہیں ہوگا۔ ہر شخص اٹھ کر یہی گمان کرے گا کہ بس ابھی سوتے تھے ابھی جاگ پڑے ہیں۔ آگے آیت ۱۹ میں یہ مضمون مزید وضاحت سے آرہا ہے وہاں اس کے تمام مخفی گوشے سامنے آجائیں گے۔

اجمال کے بعد تفصیل

'نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُمْ بِالْحَقِّ ۚ إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى' اب یہ اجمال کے بعد ان کی سرگزشت کی تفصیل سنائی جارہی ہے۔ اس کے

بالحق کا مفہوم

ساتھ 'بالحق' کی قید ایک تو اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ ان لوگوں کی نسبت جو روایات ان کے نام لیواؤں میں معروف تھیں قرآن نے ان سے غض بصر کر کے واقعہ کی اصل صورت پیش کی ہے۔ دوسری یہ کہ قرآن کے سامنے دوسروں کی طرح محض داستان سرائی نہیں ہے بلکہ اصل مقصود اس حکمت و موعظت سے لوگوں کو آگاہ کرنا ہے جو اس سرگزشت کے اندر مضمر ہے۔ فرمایا کہ یہ کچھ نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کی نگہداشت کی جس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت میں افزونی

نوجوانوں کی حوصلہ افزائی

عطا فرمائی۔ اس افزونی کا ظہور کس شکل میں ہوا ؟ اس کا بیان آگے والی آیت میں آرہا ہے یہاں 'فتیۃ' کے لفظ پہ نظر رہے۔ قرآن نے ان لوگوں کا جوانوں کے طبقہ سے ہونا ظاہر کر کے وقت کے نوجوانوں بالخصوص آنحضرت صلعم پہ ایمان لانے والے نوجوانوں کو توجہ دلادی کہ وہ اس سرگزشت سے سبق حاصل کریں اور انہی کی طرح دعوت حق کی راہ میں اپنی قوم کی عداوت سے بے پروا ہوکر چل کھڑے ہوں۔ خدا ہر مرحلہ میں ان کا ناصر و مددگار ہوگا۔

'وَرَبَطْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَنْ نَدْعُوَ مِنْ دُونِهِ إِلَٰهًا ۖ لَقَدْ قُلْنَا إِذًا شَطَطًا'

ربط اللہ علی قلبہ کے معنی ہوں گے خدا نے اس کے دل کو قوت و عزیمت دے دی۔

'شط' کے معنی دور ہونے اور 'شطط' کے معنی 'تباعد عن الحق' یعنی حق سے انحراف اور دوری کے ہیں۔

حق کی منادی

مطلب یہ ہے کہ ہر چند حالات بہت ہی سخت تھے، کلمہ حق کی دعوت دینا بڑی جان جوکھم کا کام تھا لیکن ان نوجوانوں کے ایمان میں خدا نے برکت دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ صرف اپنے ہی ایمان پہ قانع ہوکر

گھروں میں بیٹھ رہنے پر راضی نہیں ہوتے بلکہ ہر قسم کے خطرات سے بے پروا ہو کر دعوتِ توحید کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے، جب اٹھ کھڑے ہوئے تو اللہ نے اپنی سنت کے مطابق ان کے دلوں کو قوت و عزیمت بخشی اور انہوں نے اپنی قوم میں عام منادی کر دی کہ ہمارا رب صرف وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ اس کے سوا ہم کسی اور کو رب ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اگر ہم اس کے سوا کسی اور کو رب مانیں گے تو ہماری یہ حرکت نہایت ہی بیجا اور حق سے بہت دور ہٹی ہوئی ہو گی۔

هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ۭ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۭ

'قوم' سے مراد یہاں 'رقیم' کے لوگ ہیں۔ یہ ان حق پرست نوجوانوں کا اپنی پوری قوم کے لئے ایک چیلنج ہے اور عربیت کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہاں 'هٰٓؤُلَآءِ' کا لفظ جس انداز سے استعمال ہوا ہے اس سے ایک قسم کی حقارت کا بھی اظہار ہو رہا ہے۔ پھر غائب کے صیغوں میں بھی حقارت مضمر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے ڈنکے کی چوٹ اعلان کر دیا کہ یہ ہماری قوم کے بدھوؤں نے اللہ کے سوا جو اور معبود بنا رکھے ہیں تو یہ اپنے ان معبودوں کے حق میں کوئی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے۔ آخر اس سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے جو خدا کے اوپر بہتان تراشے!!

قوم کو چیلنج

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا۔

'مرفق' اس چیز کو کہتے ہیں جو آدمی کی ضرورت اور منفعت کی ہو۔ 'وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا' یعنی اس مرحلہ میں جس چیز کے تم محتاج ہو گے اللہ تعالیٰ وہ تمہارے لئے مہیا فرمائے گا۔

'رفق'

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لئے بشارت ہے اور قرینہ دلیل ہے کہ یہاں کلام کا اتنا حصہ حذف ہے جو سیاق کلام سے خود واضح ہے یعنی بالآخر ان کے اور ان کی قوم کے درمیان کشمکش اتنی بڑھ گئی کہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ لوگ ان کو، جیسا کہ آیت ۲۰ سے واضح ہوتا ہے، سنگسار کر دیں گے۔ اس وقت ان لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک خاص غار میں جو پہلے سے انہوں نے منتخب کر لیا تھا، پناہ گزین ہو جائیں گے۔ اس مرحلہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی وحی کے ذریعہ سے بشارت دی کہ اب جبکہ تم نے اللہ کی خاطر اپنی قوم اور اس کے معبودوں کو چھوڑ دیا تو اپنے منتخب کردہ غار میں پناہ گیر ہو جاؤ، تمہارا رب تمہارے لئے اپنے فضل و رحمت کا دامن پھیلائے گا اور تمہاری تمام ضروریات کا سامان

اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت کی بشارت

کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے بس یہ چاہتا ہے کہ وہ ہمت کرکے اس کی راہ پہ چلنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ جب وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو آگے کی منزل کے لئے زاد و راحلہ وہ خود فراہم کرتا ہے۔ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ

ایک شبہ کا ازالہ — ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ کیا یہ لوگ صاحب وحی تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو وحی کے ذریعہ سے بشارت دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ وحی اسی قسم کی وحی تھی جس کے ذریعے سے حضرت موسیٰؑ کی والدہ کو یہ ہدایت ہوئی کہ وہ بچہ کو ایک صندوق میں رکھ کے دریا میں ڈال دیں۔

ارباب تصوف کے ایک غلط استدلال — اس واقعہ سے بعض صوفی حضرات نے گوشہ نشینی اور ترک دنیا کی زندگی کی فضیلت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ بات ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ ان لوگوں نے اس غار میں پناہ اس وقت لی ہے جب وہ اپنے ماحول کی اصلاح کے لئے جی جان کی بازی کھیل کر اپنی قوم کے ہاتھوں سنگسار کر دیئے جانے کے مرحلہ تک پہنچ گئے ہیں۔ یہ مرحلہ بعینہٖ وہی مرحلہ ہے جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آیا اور آپ کو غار ثور میں پناہ لینی پڑی۔ ان لوگوں نے یہ غار نشینی رہبانیت کے لئے نہیں اختیار کی تھی بلکہ اعدائے حق کے شر سے اپنی جانیں بچانے کے لئے اختیار کی تھی۔

مفسرین کی ایک غلطی — عام طور پر ہمارے مفسرین نے اس آیت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت کے مفہوم میں نہیں لیا ہے بلکہ اس کو خود اصحاب الکہف کا قول سمجھا ہے کہ انہوں نے آپس میں اپنے ساتھیوں سے یہ بات کہی، لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ آیت میں جس قطعیت کے ساتھ اللہ کی مدد و نصرت کا وعدہ ہے، کوئی متواضع بندہ اس قطعیت کے ساتھ یہ بات نہیں کہہ سکتا۔ کوئی متواضع بندہ اس طرح کی بات کہے گا تو امید و رجا اور دعا ہی کے الفاظ میں کہے گا۔ چنانچہ آیت ۱۰ میں ان لوگوں کی دعا کا حوالہ بھی ہے

وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ
وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ
ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ
فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا

تزاور — 'تَزٰوَرُ' اصل میں 'تتزاور' ہے۔ اس کے معنی ہٹ جانے، کترا جانے، منحرف ہو جانے کے ہیں۔

قرض — 'تقرضھم' قرض کے معنی کاٹنے اور کترانے کے ہیں۔ اسی سے 'قرض المکان' کا محاورہ پیدا ہوا جس کے معنی ہیں اس جگہ سے ہٹ گیا، کترا گیا، گریز کر گیا۔

'فجوۃ' دو چیزوں کے درمیان کے خلا، شگاف اور گوشہ کو کہتے ہیں۔ یہیں سے اس کا اطلاق مکان کے صحن پر ہوا۔

فائدہ ضروریات زندگی کا غیبی انتظام

اوپر کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے غار میں جن ضروریات و مرافق کے مہیا فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے اب یہ ان کا بیان ہو رہا ہے کہ اگر تم دیکھ پاتے تو دیکھتے کہ سورج جب طلوع ہوتا ہے تو ان کے غار سے دائیں کو بچتا ہوا طلوع ہوتا ہے اور جب ڈوبتا ہے تو ان سے بائیں کو کتراتا ہوا ڈوبتا ہے اور وہ اس غار کے صحن میں آرام کر رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غار کا دہانہ اس طرح واقع ہوا تھا کہ اس کے اندر ہوا، روشنی اور حرارت جو زندگی کی ضروریات میں سے ہیں بآسانی پہنچتی تھیں۔ لیکن آفتاب کی تمازت اس کے اندر راہ نہیں پاتی تھی۔ ہمارے مفسرین نے غار اور اس کے دہانے کی سمت و جہت متعین کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ کاوش غیر ضروری ہے۔ اس کی مختلف شکلیں فرض کی جا سکتی ہیں لیکن ان میں سے کسی کے متعلق جزم کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ صحیح بات وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے بتا دی کہ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے کہ اس نے اپنی تدبیر و کارسازی سے اپنے بندوں کے لئے ایک ایسا غار مہیا فرما دیا جہاں بغیر کسی کاوش کے ان کے لئے ساری ضروریات زندگی فراہم تھیں اور معلوم ہوتا کہ سورج بھی ان کے پاس سے گزرتا ہے تو ادب و احترام سے گزرتا ہے کہ ان کی خدمت کی انجام دہی کا شرف تو حاصل ہو لیکن ان کے آرام و سکون میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔

ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ الایہ: اسی آیت الٰہی کے تعلق سے یہ تذکیر فرما دی کہ جہاں تک اللہ کی نشانیوں کا تعلق ہے، ایک سے ایک بڑی نشانی موجود ہے۔ لیکن نشانیوں سے رہنمائی وہی حاصل کرتے ہیں جن کو اللہ توفیق بخشتا ہے۔ جو اس توفیق سے محروم ہو جاتے ہیں، کوئی دوسرا ان کا کارساز و رہنما نہیں بن سکتا۔

وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۚ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۚ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ ۚ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا

حفاظت کے لئے انتظام

یہ وہ انتظام بیان ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کے لئے فرمایا کہ باوجودیکہ وہ غار میں محو خواب تھے لیکن صورت حال ایسی تھی کہ اگر اتفاق سے کوئی ان کو دیکھ پاتا تو یہ گمان نہ کرتا کہ وہ سو رہے ہیں بلکہ وہ یہی سمجھتا کہ جاگ رہے ہیں۔ یعنی ان کو سوتا اور بے خبر سمجھ کر کوئی ان کو نقصان پہنچانے کی

جرأت نہ کرسکتا بلکہ ان کو اپنی حفاظت کے لئے بیدار و ہوشیار خیال کرتا۔ ان کے سونے کی ہیئت ایسی تھی کہ معلوم ہوتا کہ کچھ لوگ ذرا دم لینے کے لئے بس لیٹ گئے ہیں۔ ایسی نہیں تھی کہ دیکھنے والا سمجھے کہ اٹاغفیل پڑ کر سو رہے ہیں۔

'وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ' فرمایا کہ ہم ان کو دہنے بائیں کروٹ بھی بدلواتے رہتے تھے۔ یہ کروٹ صحت جسمانی کو برقرار رکھنے کے لئے بھی ضروری ہے اور اس لئے بھی ضروری ہے کہ ایک ہی ہیئت پر پڑے پڑے جسم اکڑ نہ جائے۔ نیز یہ لوگ زمین پر ایک طویل وقفہ کے لئے سوئے تھے۔ اگر ایک ہی کروٹ پر عرصہ تک پڑے رہتے تو یہ اندیشہ تھا کہ زمین ان کے جسم کو نقصان پہنچا دے۔ اس لئے جس طرح ایک شفیق ماں گہوارے میں لیٹے ہوئے بچے کے پہلو بدلتی رہتی ہے اسی طرح قدرت ان کے پہلو بھی بدلواتی رہتی تھی۔

'وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ' یہ بھی اسی حفاظتی انتظام کے سلسلہ کی بات ہے کہ ان کا وفادار کتا غار کے دہانے پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اس طرح بیٹھا رہا کہ گویا پہرہ دے رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کتا بھی اس دوران میں برابر سوتا ہی رہا لیکن اس کے سونے کی ہیئت وہ نہیں تھی جو عام طور پر کتوں کے سونے کی ہوتی ہے بلکہ وہ تھی جو ڈیوڑھی پہ پہرہ دینے والے کتے کی ہوتی ہے۔ یہ انتظام اللہ تعالیٰ نے اس لئے فرمایا کہ کوئی عام قسم کا جنگلی جانور غار میں گھسنے کی جرأت نہ کرے۔

لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا۔ ظاہر ہے کہ اگر اس طرح کے کسی منظر پر اتفاق سے کسی کی نظر پڑ جائے گی تو وہ دہشت زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوگا۔ وہ ششدر رہ جائے گا کہ آخر پہاڑوں کے بیچ میں، ایک غار کے اندر یہ کون لوگ ہیں جو اس طرح بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ انہیں بھلے آدمی سمجھے یا برے، چور اور ڈاکو خیال کرے یا راہب اور سنیاسی، آسمانی مخلوق خیال کرے یا ارضی، انسان گمان کرے یا جنات و ملائکہ، بہرحال اس پر اس حالت سے ایک انجانے قسم کا خوف ضرور طاری ہوگا۔ یہ خوف کی فضا وہاں قدرت نے اپنے بندوں کی حفاظت کے لئے پیدا کر دی تھی۔ دنیا کے حکمران خاردار تاروں سے محفوظ محلوں میں سوتے ہیں اور مسلح سپاہی ان کا پہرہ دیتے ہیں لیکن ان کی جان کو امان نہیں۔ اللہ کے بندے غاروں اور جنگلوں میں سوتے ہیں اور مجال نہیں کہ کوئی پرندہ وہاں پر مار سکے!

وَكَذَٰلِكَ بَعَثْنَاهُمْ لِيَتَسَاءَلُوا بَيْنَهُمْ ۚ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۖ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۚ قَالُوا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا

لَبِثْتُمْ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ
اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا
يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿﴾

کارسازی کی ایک اور شان

'وَكَذٰلِكَ' یعنی ان کے معاملہ میں جس طرح اپنی کارسازی کی وہ شان ہم نے دکھائی جو اُوپر مذکور ہوئی اسی طرح اپنی یہ شان بھی دکھائی کہ ان کو اس نیند سے بیدار کیا کہ ان کے اندر باہم اس امر میں سوال و جواب ہو کہ یہ خواب کی حالت ان پہ کتنی مدت طاری رہی ہے اور بالآخر ان پہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اس مدت کا اندازہ کرنے سے وہ بالکل قاصر ہیں، صرف اللہ ہی اس مدت سے واقف ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک صاحب نے ساتھیوں سے سوال کیا کہ بھلا اس حالت میں تم نے کتنے دن گزارے ہوں گے؟ ساتھیوں نے جواب دیا کہ زیادہ سے زیادہ ایک دن یا اس سے بھی کم۔ بالآخر اتفاق اس بات پہ ہوا کہ اس مدت کا علم صرف اللہ ہی کو ہے اس وجہ سے اس سوال پہ غور کرنا بے سود ہے۔ البتہ یہ کرو کہ اپنے میں سے کسی کو یہ رقم دے کر شہر بھیجو۔ وہ پہلے تحقیق کرے کہ شہر کے کس حصہ میں پاکیزہ کھانا ملتا ہے اور وہاں سے وہ کچھ کھانے کو لائے اور خبردار! وہ دبے پاؤں جائے، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دے۔

آیت ۱۱ کے اجمال کی تفصیل

یہی وہ سوال و جواب ہے جس کا اوپر آیت ۱۲ میں اجمالاً حوالہ ہے۔ یہاں اس کی تفصیل ہو گئی جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ سوال و جواب انہی لوگوں کے درمیان ہوا۔ یہاں بھی 'لِيَتَسَآءَلُوْا' پر 'ل' غایت و نہایت کے مفہوم میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ ان کا یہ اٹھایا جانا اس نتیجہ تک منتہی ہو کہ وہ آپس میں سونے کی مدت سے متعلق سوال و جواب کریں اور یہ حقیقت ان پر واضح ہو جائے کہ اس مدت کا اندازہ کرنے سے وہ بالکل قاصر ہیں اور یہیں سے ان پر یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے کہ مرنے کے بعد برزخ کی زندگی کا بھی یہی حال ہو گا۔ قیامت کو جب لوگ اٹھیں گے تو ایسا معلوم ہو گا کہ اس حالت میں وہ ایک دن یا اس سے بھی کم رہے۔

'فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا۔' 'اَيُّهَا' یعنی 'ای اطراف المدینۃ' یا 'ای نواحی المدینۃ' اور 'ازکیٰ' سے پاکیزہ کھانا مراد ہے۔

کھانا لانے والے کو تحقیق کی تاکید

ان لوگوں نے جس وقت غار میں پناہ لی ہے اس وقت شرک و کفر کے غلبہ کے سبب سے ان کی قوم میں حرام و حلال کی تمیز نہیں تھی اس وجہ سے ان لوگوں نے اس بات کی خاص طور پر تاکید کی کہ کھانا لانے والا اس امر کی اچھی طرح تحقیق کرے کہ شہر کے کس حصہ میں نسبتاً زیادہ پاکیزہ کھانا ملنے کی

توقع ہے۔ رقیم میں آخر کچھ اہل کتاب بھی تو رہتے ہوں گے۔ اس وجہ سے توقع تھی کہ ان کے ہاں حرام و حلال کی تمیز ہوگی لیکن اس تحقیق میں یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں بات کھل نہ جائے اس وجہ سے انہوں نے یہ تاکید بھی کر دی کہ پوری احتیاط ملحوظ رہے کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔ 'تلطف' کے معنی کسی کام کو زیرکی، ہوشیاری اور احتیاط سے ڈرتے ڈرتے کرنے کے ہیں۔

آیت میں لفظ 'ورق' کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے سکہ یا روپیہ کیا ہے لیکن ہم نے رقم کیا ہے اس لئے کہ ورق کے معنی چاندی کے ہیں اور یہ بجائے خود بھی سکہ کی قائم مقام ہو سکتی ہے۔ اس وجہ سے ہم نے ایسا لفظ اختیار کیا ہے جس کا اطلاق مسکوک اور غیر مسکوک دونوں پر ہو سکتا ہے۔

اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا : اس سے اس اندیشہ کا اظہار ہوتا ہے جس کی بنا پر احتیاط اور رازداری کی تاکید کی گئی۔ جس زمانے میں ان لوگوں نے غار میں پناہ لی ہے اہل حق پر ظلم و تشدد اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا اور ان لوگوں نے سنگ سار کر دیئے جانے کے اندیشے سے یہ پناہ ڈھونڈی تھی۔ اسی اندیشہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ فرمایا کہ اگر کہیں لوگوں کو پتہ چل گیا تو پھر ہماری خیر نہیں ہے۔ پہلے تو کسی نہ کسی طرح بچ نکلے تھے۔ لیکن اب اگر وہ پا گئے تو یا تو سنگ سار کر دیں گے یا مرتد کر کے چھوڑیں گے پھر کسی طرح بھی ان سے نجات حاصل کرنا ممکن نہ ہوگا۔

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۗ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ۗ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا

اس 'کذٰلک' کا عطف اوپر والے 'کذٰلک' پر ہے یعنی جس طرح ہم نے وہ شان دکھائی اسی طرح ہم نے یہ شان بھی دکھائی کہ لوگوں کو ان سے باخبر کر دیا۔ یہاں اس بات کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ لوگ ان سے کس طرح آگاہ ہوئے۔ ہو سکتا ہے کہ جو صاحب کھانا لینے کے لئے بازار گئے انہی کو دیکھ کر بعض زیرک لوگوں نے تاڑ لیا ہو اور پھر ان کا سراغ لگانے کے درپے ہو گئے ہوں اور اس طرح آہستہ آہستہ لوگوں کی رسائی غار تک ہو گئی ہو۔ غور کرنے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اصحاب کہف کو جب یہ اندازہ ہو گیا کہ ان کی سن گن کچھ باہر پہنچ چکی ہے تو وہ اپنے غار میں معتکف ہو گئے اور اسی حال میں اللہ نے ان کو وفات دے دی اور لوگوں کو ان کی پوری پوری

اطلاع ان کی وفات کے بعد ہی ہوئی رہو۔

انکشافِ راز کی حکمت

لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا۔ یعنی اللہ نے لوگوں کو ان کے حال سے اس لئے آگاہ کیا کہ یہ اس بات کی نشانی ہو کہ اللہ کا وعدۂ قیامت شدنی ہے اور اس کے ظہور میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ قیامت کے باب میں منکرین کو سب سے بڑا شبہ یہی پیش آتا ہے کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کو بہت ہی مستبعد سمجھتے ہیں۔ اصحاب کہف کے واقعہ نے اس استبعاد کو رفع کرنے کے لئے ایک تازہ شہادت پیش کر دی کہ ایک مدت تک سوتے رہنے کے بعد وہ اپنے رب کے حکم سے پھر اٹھ بیٹھے۔ قرائن اس بات پر دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح لوگوں کو ان کے غار سے آگاہ فرمایا اسی طرح اس بات سے بھی آگاہ فرما دیا کہ ان لوگوں کی زندگی غار میں کس طرح گزری۔ اگرچہ آیت میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے لیکن یہ امر واضح ہے کہ لوگوں کو یہ بات معلوم تھی اور درحقیقت یہی چیز تھی جس کے سبب سے ان کی زندگی لوگوں کی نگاہوں میں ایک اعجوبہ بنی اور مرنے کے بعد یہ خلق کے مرجع عقیدت بن گئے۔ ہو سکتا ہے کہ جس زمانے میں لوگوں نے ان کی ٹوہ لگانے کی کوشش کی ہے اسی زمانے میں یہ راز بھی کھلا ہو اور بعد میں اس کا علم عام ہو گیا ہو اور پھر اس کی روایت نے تواتر کی حیثیت حاصل کر لی ہو۔

'اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا'

انقلاب حال

'رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ' اب یہ قرآن نے اس انقلاب حال کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ان کی وفات کے بعد ہوا کہ ایک دن تو وہ تھا کہ یہ بے چارے سنگسار کر دیئے جانے کے ڈر سے ایک غار میں چھپے یا وہ دن آیا کہ لوگ ان کے ساتھ نسبت حاصل کرنے کے لئے آپس میں جھگڑنے لگے۔ ظاہر ہے کہ یہ تنازع مختلف گروہوں، فرقوں اور خاندانوں میں واقع ہوا ہو گا، اور اس لئے ہوا ہو گا کہ ہر ایک ان کو اپنے گروہ، اپنے فرقے اور اپنے مسلک و عقیدہ کے ساتھ منسوب کرنے کا خواہش مند رہا ہو گا۔ اہل حق کے ساتھ اس ظالم دنیا نے ہمیشہ یہی معاملہ کیا ہے۔ زندگی میں تو ان کو لوگوں کے پتھر کھانے پڑے لیکن مرنے کے بعد ان کے بت پوجے گئے۔ ان لوگوں کے ساتھ بھی مرنے کے بعد یہی ہوا کہ مختلف گروہ اور فرقے ان کے ساتھ قرب کے مدعی بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک گروہ کی رائے یہ ہوئی کہ ان کے مذہب و مسلک کا معاملہ تو اللہ کے حوالہ کیا جائے البتہ ان کی یادگار میں ان کے غار پر ایک عمارت بنا دی جائے۔ لیکن دوسرے گروہ نے جس کو اکثریت حاصل تھی، کہا کہ ہم ان کی یادگار میں ایک مسجد بنائیں گے اور اسی گروہ کی رائے غالب رہی۔ اس سے اس انقلاب حال کا کچھ اندازہ ہوتا ہے جو ان جان بازوں کی قربانیوں کے نتیجہ میں برپا ہوا کہ ملک

ہیں ان لوگوں نے اکثریت حاصل کر لی جو موحد اور خدا پرست تھے اور وہ دوسرے لوگ جو موحد اور خدا پرست نہیں تھے ان کے اندر بھی اتنی فیاضی اور رواداری واقع ہو گئی کہ اصحاب کہف کی یادگار قائم کرنے کی ساعت سعادت وہ بھی حاصل کرنے کے مشتاق ہو گئے۔

[illegible]

'رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ' ہمارے نزدیک عربیت کے معروف قاعدہ کے مطابق ایک مضاف محذوف ہے یعنی 'اَعْلَمُ بِمَذْهَبِهِمْ' معلوم ہوتا ہے اس گروہ کی رائے یہ تھی کہ ان کے دین و عقیدہ کی بحث نہ چھیڑی جائے بلکہ قوم کے متفق علیہ بزرگوں اور پیشواؤں کی حیثیت سے ان کی یادگار میں ان کے غار پر ایک ہیکل کی تعمیر کی جائے لیکن دوسرے گروہ نے یہ تجویز قبول نہیں کی بلکہ اس نے ایک مسجد تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا اور یہی رائے غالب رہی۔

'عَلَيْهِمْ مَسْجِدًا' میں بھی ہمارے نزدیک ایک مضاف محذوف ہے یعنی 'علی کهفهم'۔ قرآن مجید نے ان لوگوں کی یادگار کو مسجد سے تعبیر کرکے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ یہ موحد اور خدا پرست لوگ تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے خدا کی عبادت کا گھر بنایا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہود اور نصاریٰ کے عبادت خانے اصلاً مسجد ہی تھے۔ ان میں خرابی تو اس وقت سے پیدا ہوئی ہے جب ان قوموں نے مشرکانہ عقائد اختیار کئے اور اپنے معبدوں کو شرک سے آلودہ کیا۔ یاد ہوگا قرآن نے یہود اور نصاریٰ کے 'صوامع' اور 'بیع' کو مساجد ہی کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورہ حج کی آیت ۲۲

'سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ قُل رَّبِّي أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِم مَّا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ'

فضول سوالات سے گریز کی ہدایت

اب یہ ایک جملہ معترضہ کے طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے فرمایا کہ اصحاب کہف کی اصل حقیقت تو یہی ہے جو تمہیں سنا دی گئی لیکن یہ نہ سمجھو کہ یہ سوال کرنے والے اس سے مطمئن ہو جائیں گے اور ان کی زندگیوں سے سبق حاصل کریں گے بلکہ اب کچھ لوگ یہ کہیں گے کہ ان کی تعداد تین تھی اور چوتھا ان کا کتا تھا۔ اور کچھ لوگ یہ کہیں گے کہ یہ پانچ تھے چھٹا ان کا کتا تھا۔ فرمایا کہ یہ ساری باتیں "رجماً بالغیب" یعنی محض اٹکل پچو ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ علاوہ ازیں کچھ لوگ یہ کہیں گے کہ وہ سات تھے آٹھواں ان کا کتا تھا، تم ان سے کہہ دو کہ میرا رب ہی ان کی تعداد کو خوب جانتا ہے ان کی تعداد سے صرف تھوڑے ہی لوگ واقف ہیں۔

'فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا' 'تمارات' کے معنی بحث و مناظرہ کرنے کے ہیں، مطلب

یہ ہے کہ اگر لوگ تمہارے سامنے اس طرح کے سوالات لے کر آئیں اور تم سے بحث و جدال کرنا چاہیں تو ان سے نہ الجھنا بلکہ سرسری طور پر بات کر کے ان کو ٹال دینے کی کوشش کرنا۔ اب اصحاب کہف کے باب میں کسی سے کچھ پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ جب ان کی اصل سرگزشت اللہ نے بیان کر دی تو اللہ سے زیادہ کون جاننے والا ہے جس سے رجوع کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ جن لوگوں کو بحث و مناظرہ کا روگ لگ جاتا ہے ان کو اصل حقیقت سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ان کے مناظرہ کی ایک راہ بند کیجیے تو وہ کوئی دوسری راہ نکال لیں گے اس وجہ سے کسی دانش مند کے لئے یہ زیبا نہیں کہ ایسے لوگوں کے قائل کرنے کے درپے ہو۔ ایسے لوگوں سے جان چھڑانے ہی میں خیر ہے۔ ان کے ساتھ سنجیدہ ہو کر بحث کرنے کے بجائے ان کو خوبصورتی سے ٹالنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

بعض اہل تاویل نے اصحاب کہف کی تعداد سے متعلق آخری قول کو اقرب الی الصواب قرار دیا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ پہلے دو قولوں کو تو قرآن نے صاف رجماً بالغیب قرار دیا ہے لیکن تیسرے قول سے متعلق کوئی اس طرح کی بات نہیں فرمائی ہے۔ یہ استنباط قرین صواب ہے لیکن ان کی تعداد سے متعلق ہمارا قول وہی ہے جو قرآن نے بتایا ہے کہ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ٥ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ
وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ وَقُلْ عَسٰٓي اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ
مِنْ هٰذَا رَشَدًا ٥

وعدہ مشروط بمشیت الٰہی کیا جائے

اسی ذیل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت بھی فرما دی کہ کسی امر میں یوں غیر مشروط وعدہ نہ کر لیا کرو کہ میں یہ کام کل کر دوں گا۔ اس ہدایت کی ضرورت غالباً یوں پیش آئی کہ اصحاب کہف کے متعلق جب پوچھنے والوں نے پوچھا ہو گا تو آپ نے یہ وعدہ کر لیا ہو گا کہ میں اس کا جواب کل دے دوں گا۔ اس قسم کے سوالات، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، آپ سے امتحاناً کئے جاتے تھے اس وجہ سے فطری طور پر آپ کی یہ خواہش ہوتی کہ ان کا جواب جلد دیا جائے اور آپ وحی کی رہنمائی کے بھروسہ پر وعدہ کر بیٹھتے۔ جہاں تک جواب جلد دینے کی خواہش کا تعلق ہے آنحضرت صلعم کے دل کے اندر اپنی دعوت کی سربلندی کی جو شدید آرزو تھی اس کی وجہ سے آپ یہ چاہتے تھے کہ معترضین و مخالفین کے ہر سوال و اعتراض کا جواب فوراً دیا جائے تاکہ اپنی طرف سے ان کے لئے قبول حق میں کوئی عذر باقی نہ رہے لیکن اس معاملہ کا ایک اور پہلو بھی تھا جو نظر انداز ہو گیا تھا وہ یہ کہ بسا اوقات حکمت الٰہی کا تقاضا کسی سوال

سے متعلق یہ ہوتا ہے کہ اس کا جواب نہ دیا جائے۔ یا جواب تو دیا جائے لیکن فوراً نہ دیا جائے۔ اس وجہ سے نبی کے لئے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ وہ وحی کے بھروسہ پر کوئی غیر مشروط وعدہ کر بیٹھے۔ بلکہ اس کو ہر وعدہ خدا کی مشیت کی شرط کے ساتھ کرنا چاہیئے اور اگر کبھی بھول چوک ہو جائے تو یاد آنے پر اپنے رب کو یاد کرنا چاہیئے اور جن سے وعدہ ہوا ہے ان سے کہنا چاہیئے کہ کیا عجب کہ میرا رب موعودہ مدت سے بھی کم مدت میں صحیح بات کی طرف میری رہنمائی فرما دے۔

مدت کا تعین یہود کی افواہ

وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَٰثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا آیت ۲۲ سے جو جملہ معترضہ شروع ہوا تھا وہ آیت ۲۴ پر ختم ہوا۔ اب یہ آیت انہی اقوال سے متعلق ہے جو اوپر اصحاب کہف کی تعداد سے متعلق نقل ہوتے ہیں۔ یعنی جس طرح وہ ان کی تعداد کے بارے میں یہ یہ کہیں گے اسی طرح غار میں ان کی مدت قیام سے متعلق یہ دعویٰ کریں گے کہ وہ غار میں تین سو سال اور مزید برآں نو سال رہے۔

عام طور پر لوگوں نے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر کے مفہوم میں لیا ہے لیکن ہمارے نزدیک ان کی مدت قیام کے باب میں قرآن نے کوئی قطعی بات نہیں کہی ہے۔ آیت ۱۱ میں "سنین عددا" کے الفاظ ہیں۔ وہ اس بات پر تو ضرور دلیل ہیں کہ یہ لوگ غار میں کئی سال رہے لیکن تین سو نو سال کی مدت کی تعبیر کے لئے، عربیت کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہ الفاظ بالکل ناموزوں ہیں۔ پھر اس کے بعد کی آیت "قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا" اس مطلب سے بالکل ابا کرتی ہے۔ اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے کہ وہ تین سو نو سال غار میں رہے تو پھر یہ کہنے کے کیا معنی کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ ان کی مدت قیام کو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔

کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں اس تاویل میں منفرد ہوں۔ متعدد دوسرے ائمہ تفسیر کی رائے بھی یہی ہے۔ والعلم عند اللہ۔

بقیہ گزشتہ صفحہ ۲۶

حقیقت تقویٰ[1] میں ایمان باللہ کے مختلف پہلوؤں سے جس انداز میں بحث کی ہے وہ اگرچہ باصطلاح معروف تو "علم کلام" نہیں لیکن خالص "قرآنی علم کلام" ضرور ہے۔ اور اگر مولانا اپنی سکیم کے مطابق معاد اور رسالت پر بھی اسی انداز سے لکھ سکے تو اس طرح خالصۃً قرآن حکیم کی بنیاد پر ایک نئے علم کلام کی ترتیب و تدوین کی راہ کھل جائے گی ..."

[1] مولانا کی یہ گرانمایہ تصانیف عرصے سے نایاب تھیں اب بحمد اللہ انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام یکجا حقیقت نماز کے اضافے کے ساتھ "حقیقت دین" کے جامع عنوان سے شائع ہو گئی ہیں!

اسرار احمد

علامہ شبلی نعمانی

مولانا ابوالکلام آزاد، امام حمید الدین فراہی

اور

مولانا امین احسن اصلاحی

ایک شخصیاتی موازنہ

راقم نے "میثاق" بابت اکتوبر، نومبر ۶۸ء کے "تذکرہ و تبصرہ" کے صفحات میں ایک مسلسل مضمون تحریر کیا تھا جس میں برصغیر پاک و ہند کی ملت اسلامیہ کے مختلف علمی خانوادوں کے جائزے کے ضمن میں بعض اہم اور نامور شخصیتوں کے علمی رجحانات کا تجزیہ اور ان کی دینی خدمات کا موازنہ بھی آ گیا تھا۔ ذیل کا اقتباس اسی سے ماخوذ ہے۔

راقم کو اس تحریر پر جو داد مخدوم معظم مولانا عبدالماجد دریا بادی سے ملی تھی وہ راقم کے لئے ایک قیمتی متاع کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے کہ وہ ایک ایسے شخص کی تائید و تصویب ہے، جو خود اسی دور کے "باقیات الصالحات" میں سے ہے جس سے متذکرہ بالا تین اہم شخصیتوں کا تعلق ہے۔ مولانا کا پورا خط "میثاق" بابت ۶۸ء کے کور پر طبع کر دیا گیا تھا۔ اس کا وہ حصہ جو درج ذیل اقتباس سے براہ راست متعلق ہے یہ ہے:

"حیرت ہو گئی کہ شبلی، فراہی اور ابوالکلام تینوں کی یہ نباضی، بُعدِ زمانی اور بُعدِ مکانی دونوں کے باوجود اتنی صحیح کیونکر کر لی! ع

'در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید!'...."

(اسرار احمد)

"مولانا شبلی اپنی ذات میں ایک نہایت جامع الصفات انسان تھے اور ان کی شخصیت ندوہ کی نسبت بہت زیادہ جامع اور گھمبیر تھی چنانچہ وہ بیک وقت علم و فضل، فلسفہ و کلام، شعر و ادب اور ملی و قومی سیاست حتیٰ کہ رندی اور رنگینی سب کے جامع تھے۔ ان کے اصل جانشین سید سلیمان ندوی مرحوم کی شخصیت میں مولانا شبلی

کی ہمہ گیر شخصیت کے صرف چند ہی پہلوؤں کا تسلسل قائم رہ سکا۔ لیکن ان کے زیر اثر دو ایسی ہستیاں ایسی پروان چڑھیں جو ان کی بعض صفات کی وارث بنیں اور جن میں مولانا شبلی کی شخصیت کے بعض دوسرے پہلو اجاگر ہوئے۔ ہماری مراد مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا ابو الکلام آزاد سے ہے یہ دونوں حضرات باقاعدہ تلمذ تو نہیں لیکن ان کی تربیت میں مولانا شبلی کا بڑا حصہ ہے ——— اور چونکہ برعظیم کی حالیہ مذہبی فکر کے میدان میں علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے مابین دو اہم علمی و فکری سوتے ان ہستیوں کی بدولت چھوٹے ہیں لہٰذا ان کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ ضروری ہے۔

مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم میں متعدد امور بطور قدر مشترک بھی ہیں، مثلاً ایک یہ کہ دونوں کی تربیت میں مولانا شبلی کا حصہ تھا دوسرے یہ کہ دونوں کو قرآن حکیم سے خاص شغف تھا۔ تیسرے یہ کہ دونوں اپنے وقت کے انتہائی وضع دار انسان تھے۔ چوتھے یہ کہ دونوں (مولانا شبلی کے بالکل برعکس ——— جنہوں نے اپنی "حنفیت" کی شدت کے اظہار کے لئے "نعمانی" کی نسبت کو اپنے نام کا مستقل جزو بنا لیا تھا) تقلید سے یکساں بعید و بیزار تھے اور دونوں کو اصل ذہنی و علمی مناسبت امام ابن تیمیہؒ سے تھی ——— لیکن ان اشتراکات کے بعد اختلافات کا ایک وسیع میدان ہے جس میں یہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کی بالکل ضد تھیں۔ مولانا آزاد میں شبلی کی رندی و رنگینی کا تسلسل بھی موجود رہا جبکہ مولانا فراہیؒ بالکل زاہد خشک تھے۔ مولانا آزاد کی وضعداری میں شکوہ و تمکنت کی آمیزش تھی جبکہ مولانا فراہی پر فقر و درویشی کا رنگ غالب تھا۔ مولانا آزاد "ابو الکلام" تھے اور ان کی شعلہ بیان خطابت میں ایک لاوا اگلنے والے زندہ آتش فشاں کا رنگ تھا جبکہ مولانا فراہی نہایت کم گو تھے اور ان کا سکوت ایک ایسے خاموش آتش فشاں سے مشابہت رکھتا تھا۔ جس کے باطن میں تو خیالات و احساسات کا لاوا جوش مارتا ہو لیکن ظاہر میں وہ بالکل ساکت و صامت ہو۔ مولانا آزاد کی تحریر میں اصل زور عربیت اور عبارت آرائی پر تھا جبکہ مولانا فراہی کی تحریر نہایت سادہ لیکن مدلل ہوتی تھی۔ مولانا آزاد سیاست کے میدان کے بھی شہسوار تھے اور دین کی وادی میں بھی ان کا اصل مقام داعی کا تھا جبکہ مولانا فراہی سیاست سے تمام عمر کنارہ کش رہے اور دین و مذہب کے میدان میں بھی ان کا اصل مقام آخر دم تک صرف ایک طالب علم یا زیادہ سے زیادہ ایک مفکر کا رہا ——— چنانچہ مولانا آزاد طوطئ ہند تو تھے ہی، ایک وقت ایسا بھی گزرا جب وہ "امام الہند" قرار پائے جبکہ مولانا فراہی سے ان کی زندگی میں بھی اور آج تک صرف کچھ علم دوست لوگ ہی واقف ہو سکے ——— لیکن اس کے برعکس مولانا آزاد تو آندھی کی مانند اٹھے اور بگولے کی طرح رخصت ہو گئے تا آنکہ آج وہ لوگ بھی ان کا نام لینا تک گوارا نہیں کرتے جنہوں نے اپنی قندیل خود ان ہی کی شمع سے روشن کی جبکہ مولانا فراہی ایک مستقل طرز فکر اور مکتب علمی کی بنیاد رکھ گئے۔

جن کا نام ہوا ایک ادارہ "دائرہ حمیدیہ" کے نام سے ہندوستان میں اور ایک انجمن مولانا امین احسن اصلاحی کی ذات میں پاکستان میں موجود ہے۔

قرآن مجید سے جو شغف ان دونوں بزرگوں کو تھا، مزاج کے افتاد کے فرق کی بنا پر اس کا ظہور بھی مختلف صورتوں میں ہوا۔ مولانا آزاد کی تفسیر سورہ فاتحہ اردو ادب کا تو شاہکار (CLASSIC) ہے ہی، قرآن کے جلال و جمال کا بھی ایک حسین مرقع ہے، پھر سورہ کہف کے بعض مباحث میں ان کی تحقیق و تدقیق کا تو کوئی جواب ہی نہیں، بایں ہمہ قرآن حکیم کا کوئی مرتب و منضبط فکر وہ پیش نہیں کر سکے جبکہ مولانا فراہیؒ نے قرآن حکیم کے استدلالی پہلو کو واضح کیا اور ایک طرف نظم قرآن کی اہمیت واضح کر کے تدبر قرآن کی نئی راہیں کھولیں اور قرآن پہ غور و فکر کے اصول و قواعد از سرِ نو مرتب و مدوّن کئے اور دوسری طرف اپنی بعض تصنیفات میں (جو تاحال مسوّدات ہی کی صورت میں ہیں) خالصتاً قرآن حکیم کی روشنی میں ایک نئے علم کلام کی بنیاد رکھ دی ——— جیسا کہ ہم نے عرض کیا آسمانِ شبلی کے ان "دو ٹوٹے ہوئے تاروں" سے برصغیر کی موجودہ اسلامی فکر کے دو دھارے پھوٹے ہیں جن کا تذکرہ صورت حال کے صحیح اور مکمل جائزے کے لئے ناگزیر ہے۔

مولانا فراہیؒ ——— کے علمی ورثے کے حامل مولانا امین احسن اصلاحی ہیں جنہوں نے اپنی عملی زندگی کی ابتداء ان کے مشن کی تکمیل کے ارادے اور اس کے لئے عملی جد و جہد کے آغاز ہی سے کی تھی۔ چنانچہ تحصیل علم سے فراغت کے فوراً بعد انہوں نے ایک طرف مولانا فراہیؒ کی یادگار مدرسۃ الاصلاح اعظم گڑھ کو سنبھالا۔ دوسری طرف 'دائرہ حمیدیہ' قائم کیا۔ تیسری طرف ۱۹۳۶ء میں ماہنامہ 'الاصلاح' جاری کیا جس کے ذریعے فکر فراہیؒ کی اشاعت شروع ہوئی۔ وقس علیٰ ہذا ——— لیکن ابھی یہ تمام کام بالکل ابتدائی حالت ہی میں تھے کہ حکیم فراہیؒ کا یہ جانشین ابوالکلام کے معنوی خلیفہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی "دعوت اسلامی" کی گھن گرج سے متاثر ہو کر رختِ سفر باندھ ان کی خدمت میں جا حاضر ہوا اور ایک آدھ نہیں سترہ سال ان کی شخصیت کے پیچ و خم میں الجھا رہا ——— تا آنکہ پورے سترہ سال اس دشت کی بادیہ پیمائی کے بعد آج سے دس سال قبل جب آنکھ کھلی اور ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ ماضی بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ دائرہ حمیدیہ اور فکر فراہیؒ کے تمام قدردان ہندوستان میں رہ گئے۔ یہاں یکہ و تنہا، نہ کوئی رفیق نہ ہمراہ، نہ اسباب نہ وسائل الغرض ع ——— "جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا"

ان حالات میں مولانا امین احسن اصلاحی نے جس طرح پھر "جگر لخت لخت" کو جمع کیا اور از سرِ نو اپنے کام کی ابتدا کی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس بڑھاپے کے عالم میں ان کی جوان ہمتی کی دلیل ہے ——— بہرحال

'الاصلاح' کی جگہ 'میثاق' کا اجرا ہوا جو قلّت اعوان و انصار کی بنا پر کچھ عرصہ ہچکولے کھاتی ہوئی کشتی کی مانند چلا اور پھر بند ہو گیا ——— "حلقہ تدبّرِ قرآن" قائم ہوا جس کے ذریعے چند نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ہوا لیکن کچھ عرصہ نہایت کامیابی سے چلنے کے بعد ان نوجوانوں کے اِدھر اُدھر منتشر ہو جانے کی بنا پر اس کا کام بھی بند ہو گیا ——— تاآنکہ آج سے ڈھائی سال قبل راقم الحروف' جس نے خود مولانا مودودی کی "تحریکِ اسلامی" ہی میں آنکھ کھولی تھی اور ان ہی کے واسطے سے مولانا اصلاحی سے متعارف ہوا تھا، لاہور منتقل ہوا اور اسے اللہ نے مولانا کے ان کاموں میں تعاون کی توفیق و سعادت بخشی تو اسی کے فضل و کرم سے 'میثاق' بھی از سرِ نو جاری ہوا اور بحمد اللہ تا حال جاری ہے۔ "تدبّرِ قرآن" کی جلد اوّل بھی شائع ہوئی[1] اور مولانا کے درسِ قرآن و حدیث کی ایک ہفتہ وار نشست کا سلسلہ بھی شروع ہوا جو بفضلہٖ تعالیٰ باقاعدگی سے جاری ہے[2]

راقم الحروف کو مولانا اصلاحی سے براہِ راست تلمّذ کا شرف تو حاصل نہیں تاہم یہ واقعہ ہے کہ قرآن حکیم سے جو قلبی رابطہ اور کسی قدر ذہنی مناسبت اسے حاصل ہوئی ہے وہ مولانا ہی کی تحریروں کے مطالعے سے ہوئی ہے اور راقم کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کو بھی عمرِ دراز اور صحت و فراغت عطا فرمائے تاکہ وہ اپنے استاذ مولانا فراہیؒ کے علمی ورثے کو مزید اضافوں کے ساتھ اگلی نسل کو منتقل کر سکیں، ان کے شاگردوں کو بھی توفیق دے کہ وہ اس کام کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کرنے کا عزم کر سکیں اور راقم کو بھی اس نیک کام میں تعاون کی سعادت نصیب کئے رکھے! آمین

بہرحال فکرِ فراہیؒ اور سلسلہ تدبّرِ قرآن علی گڑھ اور دیوبند کے درمیانی علمی و فکری سوتوں میں سے ایک ہے جو اپنی کمیّت اور حلقۂ اثر کے اعتبار سے تو فی الحال زیادہ اہم نہیں لیکن اپنے امکانات کے اعتبار سے یقیناً نہایت اہم ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ اس کی بنیاد چونکہ خالصتاً قرآن حکیم پر ہے اور اس میں سارا استدلال بھی قرآن ہی سے کیا جاتا ہے اور تدبّرِ قرآن کا جو خاص اسلوب و نہج اس کے ذریعے عام ہو رہا ہے اس سے انشاء اللہ 'حکمتِ قرآنی' کے بہت سے نئے گوشے سامنے آئیں گے اور فکرِ انسانی کو نئی رہنمائی ملے گی ——— مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی تصانیف 'حقیقتِ شرک'، 'حقیقتِ توحید' اور

(بقیہ صفحہ ۱۱۸ پر)

[1] بحمد اللہ اس وقت تک دو جلدیں مزید چھپ چکی ہیں اور چوتھی جلد کی کتابت کا آغاز ہونے والا ہے!
[2] افسوس کہ مولانا کے درس کا یہ سلسلہ تو ان کی علالت کے باعث جلد ہی ختم ہو گیا البتہ راقم کے درسوں کا جو سلسلہ بحمد اللہ روز افزوں ہے وہ سب مولانا ہی کے فیض کا ایک سلسلہ جاریہ ہے! (اسرار احمد)

خالد مسعود

مولانا حمید الدین فراہیؒ کی علمی خدمات

انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک برصغیر ہندوستان میں انگریز کا اقتدار نہایت مستحکم ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کے جذبۂ حریت اور شوق سلطانی کو اس نے اپنے پنجۂ استبداد سے بڑی کامیابی سے دبا دیا تھا۔ یہ عمل خالصتاً سیاسی نہ تھا بلکہ سیاسی کے ساتھ ساتھ عقلی بھی تھا۔ چنانچہ حکومت نے جو استعماری پالیسی اختیار کی اس کے تحت انہوں نے عیسائی مبلغین کو ہر قسم کی مراعات دے کر ملک کے طول و عرض میں پھیلا دیا کہ وہ لوگوں کو ان کے مذہب سے برگشتہ کریں۔ وہ مسلمان علماء سے آئے دن مناظرے کرتے اور عقل کے نام پر ایسی باتیں پھیلاتے جن کے نتیجہ میں مخاطبین کو ان کے دینی تصورات کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا کر دیا جائے اور ذہنی انجماد پیدا کر کے انہیں اپنے ڈھب پر لایا جا سکے۔ اس پالیسی کے تحت دوسرا بڑا اقدام یہ اٹھایا گیا کہ برصغیر کی معاشرت میں مغربی تہذیب و تمدن کے جراثیم ڈالے گئے۔ جو لوگ اس تہذیب و تمدن کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتے ان کی مادی ترقیوں کا میدان وسیع تھا اور جو لوگ اس سے نفرت کرتے ان کو مرعوب کرنے کے مواقع پیدا کئے گئے تاکہ وہ اپنے موقف پر قائم رہنے کی جرأت نہ کر سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریز نے جدید تعلیم کا جال پھیلایا تاکہ ہندوستان کے لوگوں کو مغربی افکار کے ساتھ وابستہ کر کے انہیں اپنے ورثۂ علمی سے بیگانہ کر دیا جائے۔ ان اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان جو پہلے ہی انحطاط پذیر تھے، جدید فکر و فلسفہ سے بالکل مرعوب ہو گئے۔ عیسائی مبلغین کی یلغار سے بچنے کے لئے ایک طبقے نے عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ بہت ساری ان حقیقتوں کا سرے سے انکار کر دیں جو وہ اپنے باپ دادا یا مذہبی رہنماؤں سے سن کر اب تک مانتے آ رہے تھے۔ لیکن اب ان کو عقلی معیار پر ثابت کرنا ان کے بس میں نہ تھا۔ جس طبقے نے جدید علوم کو اپنایا وہ ان کے چیلنج کا مقابلہ نہ کر سکے اور اپنے آپ کو الٰہی کے رحم و کرم پر ڈال دیا۔ نتیجتاً وہ تشکیک و الحاد کی

وادیوں میں کھو گئے۔ حتیٰ کہ ان میں ایک ایسا طبقہ بھی پیدا ہو گیا جس نے اپنے دین کی اساسات کو جدید فکر و فلسفہ سے ہم آہنگ کرنے کے شوق میں اگر قرآن حکیم کو اپنا مزاحم سمجھا تو خود قرآن کے مفہوم ہی کو بدلنے کی کوشش کی تاکہ اس کی بنا پر لوگوں کے اندر جدید تصورات کے لئے منافرت نہ رہ جائے چنانچہ اس دور میں انکار حدیث اور تفسیر بالرائے کا ایک مستقل مدرسۂ فکر بھی وجود میں آ گیا۔ انگریزی حکومت کے عروج کا یہی زمانہ تھا جس میں مولانا حمید الدین فراہیؒ نے آنکھیں کھولیں۔ اپنے طلب علم کے زمانہ میں انہیں مسلمان قائدین کے رجحانات سے واقف ہونے کا موقعہ ملا اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ نے کر انہیں ان فتنوں سے روشناس ہونے کا موقعہ بھی میسر آ گیا جو نئی تعلیم میں پنہاں تھے اور جن کا جال یونیورسٹی کے غیر ملکی اساتذہ پھیلا رہے تھے۔ مولانا فراہیؒ جیسا ذکی و فطین شخص اس صورت حال سے بے تعلق نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ اس یونیورسٹی کی تعلیم کے زمانہ ہی میں انہوں نے اپنے مستقبل کے لائحہ عمل پر غور و فکر کرنا شروع کر دیا۔

مولانا فراہیؒ ان نابغہ لوگوں میں سے تھے جو خواہ کسی بھی میدان کو اپنا لیں وہ اس میں انتہائی بلندیوں کو چھوتے ہیں۔ زمانہ طالب علمی ہی میں ان کا علمی پایہ مسلّم تھا۔ عربی اور فارسی میں تو وقت کے تمام ادیب ان کی برتری کے قائل تھے ہی، انگریزی ادب اور فلسفہ جدیدہ میں بھی ان کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ ان کے یورپین پروفیسروں تک کو ان کی رائے کے آگے جھکنا پڑتا تھا۔ اس لئے اگر وہ ادبیات عالیہ، عمرانیات، سیاسیات یا منطق و فلسفہ میں سے کسی ایک مضمون کو اپنے لئے منتخب کر لیتے تو بلاشبہ اس کو زمین سے اٹھا کر ثریا تک پہنچا دیتے لیکن اس سے ان کی نیکی پسند طبیعت اور اسلام سے والہانہ تعلق خاطر کو تسکین نہ ہو سکتی۔ لہٰذا انہوں نے وقت کے دھارے کے بالکل برعکس حالات کا بنظر غائر مطالعہ کیا اور مسلمانوں کو نہ صرف پیش آمدہ مشکلات کے سبب سے آگاہ کیا بلکہ ان کا ایک ایسا حل پیش کیا جو ان کو تمام فتنوں سے بچا کر لے جائے اور تشکیک کی تنگنائیوں سے نکال کر انہیں یقین و اذعان کی دولت سے مالا مال کر دے۔

غور و فکر کے بعد مولانا فراہیؒ اس نتیجہ تک پہنچے کہ مسلمانوں کی زبوں حالی دراصل قرآن مجید سے بُعد کا نتیجہ ہے۔ جب مسلمانوں نے قرآن کو اپنایا اور اپنے اخلاق اور عمل کا انحصار اسی پر رکھا تو انفرادی اور اجتماعی طور پر وہ مستحکم رہے، جسد ملی کو کامل صحت رہی اور اسلام کا علَم سرنگوں نہیں ہونے پایا۔ لیکن جونہی وہ اس کتاب سے مستغنی ہوئے انہوں نے نور و حکمت کے خزانے اپنے اوپر بند کر لئے، ان پر فساد غالب آ گیا، عقائد خراب ہو گئے، دل بگڑ گئے، بدعت اور ہوائے نفس کو در آنے کا موقعہ ملا۔ اس کے نتیجے میں ملت کا نظام منتشر ہو گیا اور شریعت کا نظم پارہ پارہ ہو گیا مسلمانوں نے عملاً قرآن مجید کو اپنی

کامل رہنمائی کا ذریعہ نہ بنایا بلکہ اس کے صرف چند پہلوؤں ہی کو لائقِ اعتنا سمجھا اس لئے وہ سابقہ امتوں کے اس جرم میں شریک ہوگئے کہ کتاب الٰہی کا ایک حصہ بھلا بیٹھے۔ اس جرم کے قدرتی نتائج ان کے سامنے آکر رہے۔ مولانا فراہیؒ نے اس بگاڑ کی اصلاح کا طریقہ یہ بتایا کہ مسلمان مشرق و مغرب کی طرف رہنمائی کے لئے دیکھنے کے بجائے خدا کی غلامی پر مطمئن ہوں، عہد فطرت کو پورا کریں اور رضائے الٰہی کے حصول کے لئے خدا کی ہدایت ہی کو رہنما بنائیں۔ اس سعادت کو حاصل کرنے کا وسیلہ قرآن مجید سیکھنا اور سکھانا، اس پر خود عمل کرنا اور دوسروں کو اس کی ترغیب دینا ہے۔ مولانا فراہی کے نزدیک انسان کی ذہنی و قلبی صفات کی تکمیل کا یہ تقاضا ہے کہ قرآن کریم سے تعلق قائم کیا جائے۔ انسان کا قرآن سے یہ تعلق جس قدر زیادہ مضبوط ہوگا وہ اتنا ہی اچھا انسان ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو چونکہ خود خدا سے سیکھا اور امت کو اس کی تعلیم دی اس لئے حضورؐ بلاشک وشبہ سب سے بہتر انسان تھے۔ حضورؐ کے بعد لوگوں میں سب سے اچھے وہ ہیں جنہوں نے حضورؐ سے قرآن سیکھا اور آگے کی نسلوں تک اس کا علم پھیلایا۔ علیٰ ہذا القیاس فرقِ مراتب، اسباب و وسائل کی کثرت و قلت، خلوص نیت اور صفت استقلال کی کمی بیشی کے مطابق ان کے بعد آنے والے لوگوں کا درجہ ہے۔ چونکہ پروردگار کی تعلیم قبول کرنے اور اس کے بندوں تک اس کو پہنچانے سے بڑھ کر کوئی بھلائی نہیں ہوسکتی اس لئے قرآن مجید ہی عبادت کی بنیاد، اس کا محور اور عبودیت کا مغز اور جوہر ہے۔ اس نقطہ نظر کے تحت مولانا نے اپنے لئے زندگی کا جو لائحہ عمل تجویز کیا اور بالآخر جس کو اختیار بھی کیا وہ قرآن مجید کو سمجھنا اور اس کے بعد اس کی تعلیم دوسروں تک پہنچانا تھا۔ جہاں تک اس دوسرے مقصد یعنی قرآن کی تعلیم کو پھیلانے کا تعلق ہے، مولانا فراہیؒ مدرسہ کی تعلیم و تدریس کے اسلوب سے مطمئن نہ تھے۔ رائج الوقت نظام تعلیم میں ایک تو قرآن مجید کی تعلیم شامل نہ ہونے کے برابر تھی حالانکہ فقہ و حدیث کے علاوہ منطق، فلسفہ اور نہ جانے دوسرے کون کون سے مضامین کو بڑی تفصیل سے پڑھایا جاتا تھا۔ دوسرے اس میں تمام تر زور فقہ کی تعلیم اور اس کے اصول پر تھا۔ مولانا کے نزدیک دین کے اہم مقاصد اخلاق، عقائد اور شرائع کی اصلاح ہیں اور قرآن مجید نے ان سب کی طرف رہنمائی دی ہے۔ یہ سب اجزا باہم دگر مل کر تزکیہ نفس کے مقصد کو حاصل کرتے ہیں انہی تینوں کی بنا پر تین علوم پیدا ہوتے ہیں یعنی علم اخلاق، علم کلام اور علم فقہ، اگر مدارس میں علم فقہ کو اصل مان کر تعلیم دی جائے تو علم اخلاق اور علم کلام اس کے دائرہ سے نکل جاتے ہیں جس کے باعث قرآن کا مدعا سمجھنے اور دین سیکھنے کے مقصد کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر مولانا اس بات کی ضرورت محسوس کرتے تھے کہ دین کی تعلیم کا طریق کار بدلا جائے اور اس میں قرآن کو اصل قرار دے کر حدیث، فقہ،

اخلاقیات، کلام وغیرہ کی تعلیم دی جائے۔ اس کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ عربی پڑھانے کے بعد پہلے قرآن مجید پڑھایا جائے اور اس کی ہدایت کی روشنی میں باقی علوم پڑھائے جائیں۔ مولانا نے اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کا انتخاب کیا جہاں مروج نصاب کو چھوڑ کر قرآن مجید کی بنیاد پر دوسرے علوم پڑھانے کی طرح ڈالی۔ انہوں نے مدرسہ کا تخیل خود متعین کیا اور اس تخیل کے مطابق نصاب درس بنایا مدرسین کو اپنے خیال سے متفق کیا اور ذہین طلبہ کو خصوصی اہتمام سے خود تعلیم دی جس میں قرآن مجید کے علاوہ جدید علوم کی تعلیم کی بھی گنجائش مل گئی۔ مقصد یہ تھا کہ یہ طلبا آگے چل کر کتاب الٰہی کے حامل اور اس ذہنی و فکری انقلاب کے علمبردار بنیں جو مولانا کے پیش نظر تھا۔ مولانا فراہی مدرسہ کی تعلیم میں جس طرح کی تبدیلی چاہتے تھے اور اس سے جن مقاصد کا حصول ان کے پیش نظر تھا ان کا اندازہ اس تحریر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو مولانا نے مدرسۃ الاصلاح کا انتظام سنبھالتے وقت لکھی۔ انہوں نے لکھا :

"مدرسۃ الاصلاح کا دعویٰ ہے کہ اس نے مذہبی تعلیم کی صراط مستقیم کو پا لیا ہے۔ اس نے اسے اپنا مقصد اساسی قرار دیا ہے۔ وہ مقصد اساسی اور وہ صراط مستقیم کیا ہے؟ وہ وہی ہے جس پر آنحضرت صلعم نے اپنی امت کو چھوڑا تھا اور جس کی آخری خطبہ میں وصیت فرمائی تھی کہ میں تمہارے لئے کتاب اللہ چھوڑے جاتا ہوں، جب تک اسے مضبوط پکڑے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ مدرسۃ الاصلاح کا دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط و تنزل کا اصلی سبب یہی ہے کہ وہ قرآن مجید کی تعلیم کو آہستہ آہستہ کم کرتے گئے اور وہ علوم جو قرآن مجید کے لئے آلہ اور وسیلہ ہو سکتے تھے ان کی تحصیل میں اس قدر معروف ہو گئے کہ وہ خود مقصود بالذات بن گئے۔ یہاں تک کہ ہوتے ہوتے قرآن مجید کے درس و تدریس کے لئے انہوں نے بالکل جگہ نہ چھوڑی اور اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ محض تلاوت و حفظِ الفاظ پر اکتفا کر لیا گیا اور ہم پر رسول خدا کی یہ شکایت منطبق ہونے لگی "یارب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا (اے میرے پروردگار، میری قوم نے اس قرآن کو ایک چھوڑی ہوئی چیز سمجھ لیا ہے)، لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مدرسۃ الاصلاح نے یہ راز پا لیا اور قرآن مجید کو سرچشمہ ہدایت و ترقی تسلیم کر کے جملہ علوم کی تعلیم اس کی تعلیم کے ماتحت کر دی۔ وہ ادب، فقہ، حدیث، تاریخ، سیر، منطق و حکمت کی تعلیم دیتا ہے لیکن اس طور پر کہ جس علم کی طرف قدم بڑھے قرآن کی روشنی میں اور جو دروازہ کھلے قرآن ہی کے اندر سے کھلے"

علم کی اصلاح کے اس نصب العین کی خاطر مولانا نے دار العلوم حیدر آباد کا گراں بہا معاوضہ، اعلیٰ اعزاز،

دنیاوی منصب اور شہری زندگی چھوڑی اور سادگی، قناعت اور گمنامی کے ساتھ اپنی عمر کا آخری حصہ مدرسہ کی خدمت میں گزار دیا۔ جہاں تک مولانا کی زندگی کے پہلے مشن یعنی قرآن مجید کو سمجھنے کا تعلق ہے ان کی زندگی کا بیشتر حصہ اس تحقیق میں صرف ہوا کہ قرآن مجید کی تعلیم زندگی کے مختلف دوائر میں کیا ہے اور اس تک رسائی کیسے حاصل کی جا سکتی ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے ایک ایسا کام اپنے ذمہ لیا جس پر امت مسلمہ نے بہت کچھ غور و خوض کیا ہے اور ایک عظیم ذخیرہ کتب ایسا دستیاب ہے جس میں قرآن مجید کی ہدایت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے اس لئے مولانا کا اس مقصد کو اپنانا محض تحصیل حاصل تھا۔ لیکن اصل صورت حال ایسی نہیں، اس کو سمجھنے کے لئے قدرے تفصیل کی ضرورت ہے۔

اہل علم سے یہ بات مخفی نہیں کہ قرآن مجید جہاں اپنے مدعا میں بالکل واضح کتاب ہے وہیں ایک صاحب فہم کے لئے اس میں اتنی مشکلات ہیں جن کے سامنے طالب کی ہمت جواب دے جاتی ہے۔ اس پر مستزاد معترضین کے اعتراضات ہیں جو قرآن مجید کے ایک مربوط کتاب ہونے ہی کو قاری کے لئے مشکوک قرار دیتے ہیں۔ جہاں تک قرآن مجید سے استفادہ کے خارجی وسائل کا تعلق ہے ان میں سرفہرست تفسیری روایات کے دفتر ہیں جو محدثین کی وساطت سے ہم تک پہنچے ہیں۔ ان میں الفاظ و آیات قرآن کے بارے میں اہل تاویل کے اقوال ملتے ہیں لیکن ان میں بڑی مشکل یہ ہے کہ ہر ہر لفظ یا آیت کے تحت دسیوں مختلف اقوال درج ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک قول کا انتخاب بالعموم مطالعہ کرنے والے کے ذاتی رجحان طبع کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ متکلمین کے طریق تفسیر میں بھی بڑی مشکلیں ہیں۔ رہے قدیم صحیفے تو ان کی صحت کی ضمانت خود یہود و نصاریٰ نہیں دیتے۔ لہٰذا قرآن مجید کا ایک طالب ان وسائل پر اعتماد کر کے کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ ان کے علاوہ فہم قرآن کے کچھ داخلی وسائل بھی ہیں۔ ان میں قرآن کے الفاظ، اسالیب بیان، دلائل، تمثیلات اور نظام وغیرہ ہیں۔ یوں تو ہر قرآن پڑھنے والا انہی وسائل سے فہم میں مدد لیتا ہے اور بعض تفسیریں بھی زبان و ادب کے مسائل سے بحث کرتی ہیں تاہم جب تک ان وسائل سے استفادہ کے قواعد منضبط نہ ہوں، اس ذریعہ سے کماحقہٗ استفادہ ناممکن ہے۔ البتہ یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اگر ان وسائل کے صحیح استعمال کی کوئی کلید ہاتھ آ جائے تو کتاب الٰہی سے استفادہ کی راہ ہموار ہو جائے گی اور اس سے جو نتائج فکر حاصل ہوں گے وہ بہت قابل اعتماد ہوں گے کیونکہ ان کے اختیار کرنے میں نصوص قرآن پر انحصار ہوگا اور ذاتی رجحان طبع کو اس میں قطعاً دخل نہ ہوگا۔

مولانا فراہی نے قرآن فہمی کے انہی داخلی وسائل پر اپنی تحقیق صرف کی اور اپنے نتائج فکر کو

مدون بھی کرتے رہے جس کے نتیجے میں مفردات القرآن، اسالیب القرآن، التکمیل فی اصول التاویل، دلائل النظام اور جمہرۃ البلاغۃ پانچ کتابیں مرتب ہو گئیں۔ ان میں مولانا نے وہ اصول وضع کر دیئے، جن کے مطابق غور کر کے قرآن کا ایک طالب علم کتاب اللہ کے جواہر ریزوں سے اپنا دامن بھر سکتا ہے اور اس عمل میں ہر قدم پر وہ خود قرآن ہی کو اپنا عناں گیر پاتا ہے۔ اسی کے سہارے اور اعتماد پر وہ فکر کی راہوں میں دُور تک بڑھتا چلا جاتا ہے اور شک اسے دامنگیر نہیں ہوتا۔

مولانا فراہی اس کلیہ کو مانتے ہیں کہ فہم قرآن کی راہ کا پہلا قدم مفرد الفاظ کی صحیح معرفت ہے۔ اگر مفرد لفظ کے معانی سمجھنے میں غلطی ہو جاتی تو غلط مفروضات قائم ہو جانے کی وجہ سے قرآن مجید سے وہ وہ فلسفہ گھڑا جا سکتا ہے جو فی الحقیقت اس کی مراد نہیں ہوتی۔ چونکہ عربی الفاظ بسا اوقات کئی معنی اپنے اندر سمیٹے ہوتے ہیں یا ان کے معانی بہت جامع ہوتے ہیں اس لئے ان کا مفہوم متعین کرنے میں بڑی مشکل پیش آسکتی ہے۔ قرآن مجید کی صحیح تاویل کا یہ تقاضا ہے کہ مفرد الفاظ کے معانی کے تمام پہلوؤں پر تحقیقی نظر ہو اور سیاق کلام کا خیال کر کے وہ معنی لئے جائیں جو موقع کلام میں صحیح بیٹھتے ہوں۔ مولانا فراہی مفرد الفاظ کی تحقیق میں خود قرآن مجید اور زمانۂ نزول قرآن کے عربی ادب کے نظائر و شواہد سے استفادہ ضروری قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب مفردات القرآن میں ۷۷ الفاظ قرآن کی تحقیق بیان کر کے دوسروں کے لئے کام کا دستہ کھولا ہے۔ یہ ۷۷ الفاظ یا تو وہ ہیں جو قرآن کی حکمت سے واقف ہونے کے لئے بنیادی اہمیت کے حامل تھے یا ایسے الفاظ ہیں جن کو اہل غرض نے غلط معنی پہنا دیئے تھے اور ان کی وجہ سے تفسیر قرآن میں غلطی کے دروازے کھلتے تھے۔

مفرد الفاظ جب جملوں میں استعمال ہوتے ہیں تو مفہوم کلام کا بہت کچھ انحصار ان الفاظ کے موقع و محل پر ہوتا ہے۔ ہر زبان کی طرح عربی کے اپنے الگ اسالیب بیان ہیں جن سے واقفیت نہ ہو تو قرآن کا بہت سا مدعا نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ مولانا فراہی کی رائے میں اسالیب سے لاعلمی کی بدولت پڑھنے والے کی معانی پر بھی گرفت نہیں ہوتی۔ وہ مثال میں سورہ بقرہ کی یہ آیت پیش کرتے ہیں من کان عدوا للہ و ملائکتہ و رسلہ و جبریل و میکال فان اللہ عدو للکافرین۔ مولانا کے نزدیک اس آیت مبارکہ کا اسلوب ہی حسب ذیل معانی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

(۱) ملائکہ کی دشمنی اللہ کی دشمنی ہے (۲) ملائکہ سے دشمنی کفر ہے (۳) جبریل و میکال ملائکہ اور رسل ہیں (۴) جبریل و میکال جلیل القدر فرشتے ہیں (۵) رسول ملائکہ ہی کی ایک قسم ہیں (۶) یہود جبریل و میکال کے دشمن تھے (۷) یہود اللہ کے دشمن ہیں وغیرہ۔ اسالیب زبان سے ناواقف شخص اتنے نکات تک

رسائی نہیں پا سکتا۔ اس کے علاوہ خطاب میں چونکہ دل کے جذبات و احساسات کا اظہار بھی ہوتا ہے، رحمت، غضب، افسوس، سختی اور نرمی کا ہر جذبہ الفاظ کے در و بست سے ابل پڑتا ہے، اس لئے اسالیب سے ناواقفیت کے باعث ایک شخص کلام کا رخ اور اس کا مزاج بھی نہیں سمجھ سکتا۔ مولانا فراہی نے اسالیب کے اس اہم بیان کو اپنی کتاب اسالیب القرآن کا موضوع بنایا ہے اور اس میں ۳۲ اسالیب متعین کر دیئے ہیں۔

یہ دونوں کتابیں تو صرف الفاظ و اسالیب کے وسائل تک بحث کرتی ہیں "التکمیل فی اصول التاویل" مولانا فراہی کی وہ کتاب ہے جس میں انہوں نے تدبرِ قرآن کے اصول پیش کئے ہیں ان کی رائے میں تاویلِ قرآن کا علم علمائے حاصل تو کیا لیکن اس کا استعمال صرف فقہ کی خدمت تک محدود رکھا جس سے دین سیکھنے کے مقصد کو بڑا نقصان پہنچا۔ اس علم پر اس طرح کا کام نہ ہو سکا جو ایک مستقل فن کے لئے ہونا چاہیئے تھا۔ پھر چونکہ اس کا استعمال ایک محدود دائرے میں ہوتا رہا اس لئے اس میں وہ احتیاط بھی نہ ہو سکی جو اصول دین کے لئے کی جاتی ہے۔ اصول تاویل مدون نہ ہونے کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہر شخص نے اپنی سمجھ کے مطابق قرآن کا ایک مفہوم فرض کر لیا اور اس کے سوا ہر دوسرے مفہوم کو غلط قرار دے دیا چنانچہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت پر اختلاف رائے پیدا ہو گیا اور امت کئی گروہوں میں بٹ گئی۔ اگر تاویل قرآن کے قواعد و ضوابط طے کر لئے جاتے تو فکر و رائے کا یہ انتشار نہ ہونے پاتا اور امت ایک وحدت ہوتی۔ مولانا فراہیؒ نے تاویل قرآن کے جو اصول منضبط کئے ہیں ان میں سرفہرست کلام کا نظم و ربط ہے جو کلام کے صحیح سمت کو متعین کرنے والی واحد چیز ہے جس سے اہل بدعت و ضلالت کی کجرویوں کی اصلاح ہو سکتی ہے اور خدا کا کلام غلط تاویلوں اور تحریفوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ جس طرح رنگ برنگ کے بکھرے ہوئے پھول وہ تاثر نہیں دیتے جو ایک خوبی سے گوندھے ہوئے ہار سے ملتا ہے یا متفرق اعضا کو الگ الگ دیکھ کر اس کامل انسان کا قیاس نہیں کیا جا سکتا جو ان اعضا کے جڑنے سے بنتا ہے اسی طرح قرآن مجید کی آیات کو باہم مربوط کرکے جب تک نہ پڑھا جائے وہ حکمت حاصل نہیں ہوتی جو اسے مربوط کلام کی حیثیت سے پڑھنے پر حاصل ہوتی ہے۔ مولانا کی تحقیق میں قرآن مجید کی ہر سورہ ایک وحدت ہے اور وہ کسی خاص مضمون کو ادا کرتی ہے۔ اس کی تمام آیات اس مرکزی مضمون ہی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں۔ اسی نظم کلام کے علمی و عملی پہلوؤں کو مولانا نے اپنی تصنیف دلائل النظام میں واضح کیا ہے۔

قرآن مجید کے مطالعہ میں درپیش آنے والی بعض اور مشکلات کو حل کرنے کے لئے مولانا فراہی نے چند دوسری کتابیں بھی لکھیں جن میں اقسام القرآن سرفہرست ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے قسم کی حقیقت اور اس کی مختلف قسموں پر اصولی بحث کرنے کے بعد قرآن مجید کی قسموں کا استدلالی پہلو واضح کیا ہے اور

تفسیر کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ایسا قاعدہ مرتب کیا ہے جس سے قصوں پر مشتمل آیات کے ایک صحیح محل تک رسائی حاصل ہو سکے۔ قصوں اور تاریخی حوالوں پر غور کرنے کے لئے مولانا نے اپنا طریق کار اپنی تصنیف 'الرای الصحیح فی من ہو الذبیح' میں واضح کیا۔ اس کتاب میں استنباط مسائل کے دقیق قاعدے بیان ہوئے ہیں۔ اس میں یہود و نصاریٰ کی اسلام دشمنی کی بھی واضح مثالیں ملتی ہیں اور ان کی ریشہ دوانیوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ قرآن کی فصاحت و بلاغت کو جانچنے کے لئے مولانا فراہی نے کتاب جمہرۃ البلاغۃ لکھی، جس میں مروجہ علم بلاغت کو یونانیوں سے ماخوذ ثابت کیا اور یہ دکھایا کہ عربی ادب اور خصوصاً قرآن حکیم کی خوبیوں کو جانچنے کے لئے یہ فن بلاغت کسی طرح کسوٹی کا کام نہیں دے سکتا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے فصحائے عرب کے کلام سے بلاغت کے وہ اصول بھی متعین کر دیئے جو بلاغت قرآن کو پرکھنے کے لئے معیار کا کام دے سکتے ہیں۔

یہاں تک تو مولانا فراہی کا کام صرف اصولی نوعیت کا تھا اور تدبر قرآن کے ان اصولوں کی تدوین کے وہ امام ہیں جو ان کتابوں میں زیر بحث آئے ہیں۔ آگے کا مرحلہ ان اصولوں سے عملاً استفادہ کا تھا۔ ان کے عملی پہلو واضح کرنے کے لئے مولانا فراہی نے قرآن مجید کی متعدد سورتوں کی تفسیر لکھی جن میں سے آخری پاروں کی چودہ سورتوں کی تفسیر "مجموعہ تفاسیر فراہی" کے نام سے مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔ ان سورتوں کے مطالعہ سے ایک قاری پر جو نمایاں اثرات پڑتے ہیں وہ یہ ہیں :-

(ا) قرآن مجید کی ہر سورہ اوّل تا آخر بالکل مربوط ہے اس لئے قرآن مجید پر یہ اعتراض کہ اس کی آیات بے ربط ہیں بالکل بے بنیاد ہے۔ تمام سورتیں نہ صرف اندرونی طور پر مربوط آیات پر مشتمل ہیں بلکہ اپنی سابق و لاحق سورتوں کے ساتھ بھی مربوط ہیں۔ مضمون کا ایک پہلو اگر کسی سورہ میں بیان ہوا ہے تو اس کا دوسرا پہلو دوسری ملحقہ سورہ میں ہے۔

(ب) متعدد متواتر سورتیں کسی ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتی ہیں اس لئے اگر مجموعی طور پر ان سب پر غور کیا جائے تو حکمت قرآن کے بعض ایسے پہلو نگاہ میں آتے ہیں جن کی طرف الگ الگ ان سورتوں کو پڑھنے سے ذہن منعطف نہیں ہوتا گویا قرآن میں سورتوں کے ہم مضمون مجموعوں کی تلاش بھی ایک ضروری کام ہے۔

(ج) قرآن کے مطالعہ میں سہل انگاری نہایت مہلک ہے۔ قرآن مجید کا ایک ایک لفظ اہم ہے اور دادِ تحقیق چاہتا ہے۔ ہر لفظ کے اندر معانی کا ایک دفتر پوشیدہ ہے اس لئے وہ شخص قرآن سے مستفید نہیں ہو سکتا جو آبِ رواں کی مانند آیات کے اندر سے گزر جانے کا عادی ہو۔

(د) دین اسلام بڑا منظم دین ہے اس کی تمام عبادات باہم متعلق ہیں اور کچھ مقاصد کی حامل ہیں عبادات کا باہمی تعلق نظم قرآن پر تدبر سے واضح ہوتا ہے۔

مجموعہ تفاسیر فراہی کو پڑھ کر قرآن مجید پر غور و تدبر اور اس سے استنباط مطالب کا طریقہ سمجھ میں آتا ہے عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ مصنف نے تدبر کے صحیح اصول اپنا کر حکمت دین کے کیسے کیسے جواہر ریزوں تک رسائی حاصل کی ہے ورنہ یہ خزانہ اوراق میں مدفون ہی رہتا۔

سورہ ذاریات اور سورہ التین کی تفسیروں میں قرآن مجید کی قسموں کا مضمون سورہ سے ربط بڑی خوبی سے بیان ہوا ہے اور قسموں کے اندر استشہاد کا پہلو بالکل واضح ہو کر سامنے آتا ہے سورہ تحریم اور سورہ عبس میں خطاب کی باریکیاں زیر بحث آئی ہیں۔ نیز عصمت انبیا کے بارے میں بڑی دل نشین اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے جس سے اس مسئلہ کی تمام مشکلات دور ہو گئی ہیں۔ سورہ عصر اور سورہ کوثر کی تفسیروں سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی بظاہر چھوٹی سورتیں اپنے اندر کتنے وسیع الاطراف مضامین کو سمیٹے ہوئے ہیں اور ان پر فکر و تدبر کرنے کا طریقہ کیا ہے۔

مولانا فراہی قرآن مجید کے مطالعہ و تدبر کی حد پر رک جانے کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک تدبر کا اصل فائدہ قرآن کی حکمت تک رسائی حاصل کرنے میں ہے۔ یہ رسائی اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی، جب تک ہر مسئلے کو پورے قرآن کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے۔ قرآن مجید میں ایک ہی مسئلہ مختلف پہلوؤں سے مختلف سورتوں میں سامنے آتا ہے۔ اگر سب مقامات پر صحیح اصولوں پر غور کیا جائے تو قرآن مجید کی حکمت روشن ہو کر سامنے آتی ہے۔ اس حکمت قرآن کے بعض مباحث تو مولانا فراہی کی تفاسیر میں بھی آ گئے ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی انہوں نے کئی مستقل موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ یہاں ان سب کی تفصیل کا موقعہ نہیں صرف مجمل تذکرہ کافی ہوگا۔

مولانا نے دین کے بنیادی عقائد پر اپنی کتاب القائد الی عیون العقائد میں قرآن کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں ذات صفات و باری تعالیٰ، انسان کی غایت تخلیق، دنیا میں خیر و شر کا وجود، ہدایت و ضلالت کے بارے میں سنت اللہ اور مسئلہ جبر و اختیار جیسے اہم مسائل زیر بحث آئے ہیں اور علم کلام کو جن اصولوں پر مرتب ہونا چاہیئے ان کی طرف رہنمائی دی گئی ہے۔

دنیا میں مصائب و تکالیف کے نزول اور قوموں کے عروج و زوال کے بارے میں حکمت قرآن کو جمع کر کے مولانا نے ایک کتاب 'ملکوت اللہ' تصنیف کی ہے۔ انہوں نے یہ دکھایا ہے کہ قوموں کی شکست و ریخت کا سبب خدا کی صفت رحمت و عدل کا ظہور ہے۔ اسی ذیل میں مولانا فراہی نے اس کتاب میں اسلامی

اصول سیاست اور منصب خلافت پر بھی بحث کی ہے اور خلیفہ اور اولوالامر کے اوصاف اور فرائض و حقوق پر روشنی ڈالی ہے، نیز یہ بتایا ہے کہ سلب خلافت کی وجوہات کیا ہوتی ہیں۔

مولانا فراہی کی ایک اہم کتاب 'الرائع فی اصول الشرائع' ہے۔ اس میں انہوں نے شریعت کے احکام کی درجہ بندی کی ہے اور ان کے مقاصد متعین کئے ہیں۔ احکام کی حکمتوں کو واضح کرنے کے لئے نماز، روزہ اور جہاد کے احکام پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

مولانا فراہی حکمت قرآن پر اس تحقیق کے ذریعہ سے یہ چاہتے تھے کہ تمام دینی علوم کو قرآن مجید کی بنیاد پر مرتب کرنے کی کوشش کی جائے اور اس ضمن میں جن بنیادی اصولوں کی ضرورت ہے ان کو قائم کر دیا جائے تاکہ مسلمان کا کوئی علم قرآن مجید سے بیگانہ نہ ہو بلکہ اسی کی ہدایت کی روشنی میں ہو۔ مولانا کے اسی عزم کی آئینہ دار وہ کاوشیں ہیں جو انہوں نے اپنی تصنیف حجج القرآن میں کی ہیں۔ اس کتاب میں مولانا نے منطق اور فلسفہ قدیم و جدید کی خامیوں سے بحث کی ہے اور اس کے بالمقابل قرآن مجید سے ماخوذ فلسفہ کے اصول بیان کر کے ان کی عقلی قدر و قیمت واضح کی ہے۔ اسی طرح اصول فقہ کی طرف ایک نیا قدم ان کی تصنیف احکام الاصول باحکام الرسول میں نظر آتا ہے۔ اس کتاب میں مولانا فراہی نے نبی صلعم کی تعلیمات اور ہدایات کو قرآن مجید سے مستنبط ثابت کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں ان کے ذہن میں ایک اور کتاب فقہ القرآن کی ترتیب بھی تھی لیکن وہ اس پر کام نہ کر سکے۔

مذکورہ تفصیل سے ہر شخص یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ مولانا فراہی نے اس دور میں قرآن کے فہم کی ایک نہایت قابل اعتماد اور بے خطر راہ کھولی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ لوگ اس سرچشمہ فیض سے سیراب ہوں اور کتاب الٰہی کی حکمتوں کے خزانوں سے اپنے دامن بھریں۔ اس عمل میں مولانا کے پیش نظر یہ بات تھی کہ قرآن حکیم کو مرکز بنا کر تمام اسلامی علوم کو از سر نو مرتب کر دیا جائے تاکہ آدمی پر جو دروازہ بھی کھلے وہ قرآن کی رو سے کھلے اور وہ جس راہ پر بھی چلے قرآن کی روشنی اس کی رہنمائی کرے۔ مولانا کے نزدیک یہی راستہ مسلمانوں کے علم کی درستی کا تھا اور اسی کے نتیجے میں ایک صحیح قسم کا فکری انقلاب بپا ہونے کی توقع تھی۔ اگرچہ مولانا کی زندگی نے اتنی وفا نہ کی کہ وہ یہ سارے کام از سر نو خود انجام دے سکتے۔ لیکن انہوں نے اس بارے میں واضح اشارات چھوڑے ہیں اور کام کا خاکہ تک ترتیب دے دیا ہے۔ اب یہ ان کے بعد آنے والوں کا کام ہے کہ وہ ان کے فکر کو نہ صرف زندہ رکھیں بلکہ ترقی دے کر دنیا میں علم صحیح کے علمبردار بنیں۔ اس کے نتیجے میں یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ زمانہ اسلام کی حقانیت اور برتری کا قائل ہو سکے اور مسلمان اپنا کھویا ہوا وقار پھر حاصل کر لیں۔

محمود احمد لودھی

امام فراہیؒ کے اصولِ تفسیر

امام فراہیؒ نے اپنی تفسیر کا نام "نظام القرآن و تاویل الفرقان بالفرقان" رکھا تھا۔ اور مقدمۂ تفسیر میں بھی انہی دو اصولوں یعنی نظمِ قرآن اور تفسیر آیات بالآیات سے بحث کی ہے۔ رہے وہ سولہ مقدمات جو تفسیر کے شروع میں لکھ دیئے ہیں تو اُن میں بھی انہی دو اصولوں کی فروع کا ذکر ہے اب ہم ان اصولوں کو اسی ترتیب سے لیتے ہیں۔

نظمِ قرآن : علماء کی ایک جماعت کو قرآن کی سورتوں اور آیات کی باہمی مناسبت کی تلاش اور جستجو رہی ہے۔ علامہ زرکشیؒ نے برہان میں اور اُن کے بعد علامہ سیوطیؒ نے اتقان میں علما کی ان کاوشوں اور اس موضوع پہ لکھی گئی بعض کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ زمانہ قریب میں صاحبِ تفسیر حقانی نے بھی مناسبت و ترتیب کے انکشاف اور توضیح کی سعی کی ہے۔ یہ علما برابر اس امر پہ غور کرتے رہے کہ ایک سورہ کو دوسری سورہ کے پہلو میں کیوں جگہ دی گئی ؟ یا ایک آیہ کو دوسری آیہ اور ایک مجموعہ آیات کو دوسرے مجموعہ آیات کے پہلو میں کیوں رکھا گیا تھا؟ اس کاوش میں انہیں جو مل گیا اس کے لئے وہ شکر گزار ہوئے اور مزید کے آرزومند۔ تاہم اپنی آرزوؤں میں شاد کامی انہیں کم ہی نصیب ہوئی، اس لئے کہ آگے پیچھے ہونے کے باوصف، بعض آیات اور سورتوں کو ایک دوسرے سے کوئی ظاہری مناسبت ملتی ہی نہیں چنانچہ بعض ذہین لوگوں کا بھی یہ حال ہوا کہ وہ جب جملہ ہائے معترضہ کو متعین نہ کر سکے اور اگلی پچھلی آیات یا سورتوں کی مناسبت دریافت نہ کر سکے تو انہوں نے سرے سے ایسی مناسبت ہی کا انکار کر ڈالا اور ایسا بھی ہوا کہ بعضوں نے کسی ادنیٰ درجے کی مناسبت پہ قناعت کر ڈالی اور مزید کاوش سے اُس مناسبت کی جستجو نہ کی جو سارے کلام کی چول سے چول بٹھا دے اگرچہ یہ حسنِ نظام، اعجازِ نظم، ربطِ کلمات، ترتیبِ آیات۔ نظمِ کامل اور ترتیبِ حسن کی ترکیبیں بھی اُن کے ہاں ملتی ہیں، اور قرآن کے کلام واحد ہونے اور نظم کے حسین ترین پہلو پہ ہونے کا دعویٰ بھی ملتا ہے

لیکن جو کچھ انہوں نے فی الواقع دریافت کیا اور حسنِ نظام اور ترتیب و مناسبت کے نام سے جو کچھ پیش کیا وہ ایسا نہ تھا کہ دوسروں کو اس اصول کی قدر و قیمت کا معترف بنا سکتا۔

اس ترتیب اور مناسبت سے آگے بڑھ کر امام فراہیؒ نے نظم اور نظام کی جستجو کی جو ہر سورہ کو ایک مکمل وحدت کا روپ دے سکے اور پھر اگلی پچھلی (یا اُن سے متصل) سورتوں کے ساتھ اُس کی ایسی مناسبت قائم کر سکے جو انہیں ایک لڑی میں پرو کر رکھ دے، یہاں تک کہ پورا قرآن ایک ایسے کلام واحد کے رنگ میں جلوہ گر ہو جس کے اجزا میں شروع سے آخر تک ایک حسین ترتیب اور ایک دلآویز مناسبت ہو۔ ایسا نظام ہی ہر سورہ کو ایک ایسی مشخص صورت عطا کر سکے گا جس میں معانیٔ کلام آپس میں گہرا ربط رکھتے ہوں اور ایک ہی مرکزی مضمون یا عمود کی جانب رواں دواں ہوں۔ اور کلام اپنے اتقان، وضاحت اور دل ربائی کے ساتھ نمودار ہو۔ ایسا نظام ہی اس حسنِ ترتیب اور مناسبت کو نمایاں کر سکے گا جو سورتوں کی تقدیم و تاخیر میں مضمر ہے۔ امام فراہیؒ نے قرآن مجید پر تدبّر اور اس کے نظام کی تلاش و جستجو کا کام دمِ آخر تک جاری رکھا اور اگرچہ ان کی تفسیر نظام القرآن نامکمل رہی اور اس کے صرف چند اجزا ہی چھپ سکے تاہم انہوں نے باقی سورتوں کی خاص خاص مشکلات اور اُن کے نظام پر بھی یادداشتیں چھوڑی ہیں۔ ان کی تصنیف "دلائل النظام" میں بھی اس موضوع پر سیر حاصل بحث ملے گی۔ اُس میں ایک فصل تو امام فراہیؒ نے سورتوں کے باہمی نظم اور نظم عمودی کے بیان کے لئے مخصوص کی ہے، ایک اور فصل میں تمام سورتوں کے عمود بالاجمال بیان کئے ہیں اور ایک نامکمل فصل سورۂ فاتحہ تا سورۂ اعراف کے مطالب کی تلخیص اور اُن کے نظام کے بیان میں ہے۔ اگرچہ تفسیر سورہ بقرہ اور سورۂ آل عمران کا کچھ حصّہ بھی انہوں نے مسوّدے کی شکل میں چھوڑا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ طویل اور مفصّل سورتوں کی تفسیر وہ سپرد قلم نہ کر سکے جس سے ان لوگوں کے شبہات کا ازالہ ہو سکتا جو قرآن کے اکثر حصّے کو تو منظم مانتے ہیں مگر صرف خاص خاص سورتوں یا خاص مقامات میں بدنظمی پاتے ہیں۔

امام فراہیؒ پر نظم کا دروازہ سب سے پہلے سورۂ بقرہ اور سورۂ قصص میں کھلا اور اس کی طرف بھی اُن کی رہنمائی باہر سے نہیں بلکہ خود قرآن کے اندر سے ہوئی۔ وہ کہتے ہیں "میں قرآن کی تلاوت کا ہمیشہ سے دلدادہ رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ میری سب سے زیادہ محبوب اور لذیذ کتاب یہی رہی ہے۔ میں سُنا کرتا تھا کہ قرآن مجید چونکہ مختلف اوقات و حالات میں، تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ہے، اس وجہ سے نظم کے اعتبار سے یہ سب سے زیادہ منتشر کتاب ہے۔ لیکن دو سورتوں میں

مجھے نظم معلوم ہو گیا تو بقیہ سورتوں پر غور کرنے کی مجھے تحریک ہوئی۔ یہ اُس زمانے کا قصّہ ہے جب میں ابتدائی زندگی کی تعلیمی مشغولیتوں میں منہمک تھا اور اس طرح کے کسی کام کے لئے بہت کم وقت بچا سکتا تھا۔ اس طرح دس سال سے کچھ زیادہ مدّت بیت گئی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق نے میری دستگیری فرمائی اور میں نے قرآن پر ایک طرف سے" اس نقطۂ نظر سے غور کرنا شروع کیا۔ سال بھر کی مدّت میں اس کام کو میں نے تمام کیا"۔ اس فکر و تدبّر کا نتیجہ لوگوں کے سامنے پیش کرنے میں امام فراہیؒ نے کسی جلد بازی سے کام نہیں لیا بلکہ عرصے تک اس بارے میں متامل رہے۔ اُن کا اپنا بیان ہے "... ایک عظیم ذمّہ داری اور اسی کے دوُررس نتائج کے ہیبت ناک احساس نے مجھے ڈرا دیا۔ چنانچہ ایک طویل مدّت تک میں قرآن مجید پر بار بار غور کرتا رہا اور اللہ تعالیٰ سے بار بار دعا مانگتا رہا کہ مجھے نفس کی شرارتوں اور جہل کی آفتوں سے محفوظ رکھے۔ ہر چند کہ حقیقت ایک عرصے سے میرے سامنے بالکل واضح تھی لیکن میری دلی خواہش یہی رہی کہ میں اُس کے اظہار کی مسئولیت اور اس کے خیر و شر کی ذمّہ داریوں سے اپنے آپ کو بچائے جاؤں۔ لیکن مندرجہ ذیل اسباب نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس ذمّہ داری کے اٹھانے سے گریز نہ کروں۔" یہاں امام فراہیؒ نے نظم کا لحاظ نہ رکھنے کے سبب سے تاویل کے اختلاف اور اہل بدعت و تحریف کی کجرویوں، ملحدین کے اعتراض بے نظمی اور علما کے سکوت و اعتراف، نظم قرآن کو نظر انداز کرکے خود قرآن کے ایک حصّے کو فراموش کرنے کے نتیجے میں عداوت اور بغضا کی وبا وغیرہ پر بحث کی ہے۔

اب آپ کو اس امر کا احساس ہو گیا ہوگا کہ نظمِ قرآن کی حیثیت، امام فراہیؒ کے نزدیک، ایک شئے زائد کی نہیں جو علمی لطائف اور نوادر پر مشتمل ہو بلکہ کلام کے ایک جزء یا صحیح تر الفاظ میں اہم ترین جزو کی ہے جو تمام اجزائے کلام کا صحیح مرتبہ اور مقام متعین کرتا ہے۔ علاوہ ازیں کلام کے بعض پہلوؤں کا فہم صرف نظام ہی کی مدد سے حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً دعویٰ اور دلیل میں تقریب، جس بات پر استدلال کیا گیا ہو اُس کا یقین، مصداق کی تعیین، حسنِ تقسیم اور حسنِ ترتیب کا ادراک وغیرہ۔ اسی طرح حسنِ کلام، حسنِ نظام اور قوتِ استدلال کی معرفت ہی شوق، محبّت اور لذّت کو چند در چند کر سکتی ہے۔ مزید برآں "تدبّر، تفکّر اور تذکّر کی راہ اختیار کرنے سے حکم الٰہی کی تعمیل کی سعادت بھی حاصل ہوتی ہے پھر نظم ہی کی جستجو سے حکمت جیسی نعمت ملتی ہے۔ سب سے پہلے فکر و نظر کے فطری اصول ملتے ہیں جنہیں برتنے سے آدمی کشاں کشاں حکمت کی طرف بڑھتا ہے یہاں تک کہ وہ حکمتِ دین سے بہرہ ور ہو جاتا ہے جس کی حاجت اس زمانہ فتنہ و فساد میں شدید تر ہے۔ آج احکام ظاہر پر اطلاع کافی نہیں۔ احکام عقائد اور نیت سے بندھے ہوئے ہوتے ہیں اور ان دونوں کا تعلق اخلاق کے باطنی

پہلوؤں سے ہے۔ اسی طرح افراد کی اصلاح جماعت کی اصلاح سے وابستہ ہوتی ہے جو اپنی جگہ حکمت اور تدبیر کی محتاج ہے چنانچہ جب دین و شریعت مستحکم ہوں اور معاشرہ حالتِ صحت میں ہو تو ہمیں نیت و اخلاق کی تطہیر اور فرد اور معاشرے کی اصلاح کے اصولوں کی کچھ ایسی حاجت نہیں ہوتی۔ لیکن جب فساد کا غلبہ ہو جائے، عقائد بگڑ جائیں، ملت کا نظام درہم برہم ہو جائے، شریعت کا قوام جاتا رہے اور بدعت اور ہوائے نفس کا دور دورہ ہو جائے تو حکمت الٰہیہ کی حاجت فزوں تر ہو جاتی ہے تاکہ شقاق فی الدین کے فتنوں سے نجات ملے اور امراض ملی سے شفا کی راہیں کھلیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حکمت و بصیرت اس شخص کو ملنے کی نہیں جو آندھی کی طرح قرآن مجید پر سے گزر جانے کا عادی ہو۔ اس کے لئے لازم ہے کہ آیات الٰہی میں تفکر اور کتاب الٰہی میں تدبر سے کام لیا جائے اور نظم کی گتھیوں کو سلجھا دیا جائے۔

قرآن مجید پر بے نظمی کا الزام ملحدین کی طرف سے بھی لگایا جاتا ہے اور علماء نے بھی قرآن کے نظم کو آشکار کرنے کی بجائے اس الزام پر سکوت اختیار کیا ہے بلکہ بعض مثالیں ایسی بھی ملیں گی کہ خود مسلمانوں کے حلقے سے اس الزام کی صدائے بازگشت بلند ہوئی ہو۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر بیل (DR BELL) کو لیجئے انہیں اس بات پر اصرار تھا کہ قرآن مجید میں شدید قسم کی بے نظمی ہے جو غالباً اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ قرآن مجید کے لئے وافر لکھائی کا سامان نہ ہونے کے سبب سے بعد میں نازل ہونے والی آیات، پرانی تحریروں کی پشت پر لکھ لی جاتی تھیں۔ بعد ازاں قرآن کو جمع کرنے والوں کو التباس ہو گیا اور آیات آپس میں خلط ملط ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے زعم میں قرآن مجید کو ترتیب نو بھی دے دی ہے۔ یہی حال دوسرے مستشرقین کا ہے۔ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ مستشرقین کو اپنے باطل نظریات کی تعمیر کے لئے مسالہ بھی فراہم کرتے ہیں۔ اور ان سے کچھ آگے بڑھ کے قرآن کی بے نظمی پر اصرار بلکہ فخر بھی کرتے ہیں۔ ان حالات میں اہل حق کے لئے لازم ہے کہ قرآن مجید کے نظام کی گتھیاں سلجھائیں اور اپنے پراثے کے لئے اطمینان کا سامان مہیا کریں۔

نظم کلام کو نظر انداز کر کے قرآن کی من مانی تاویل کرنے کی جسارت، اہل بدعت و ضلالت اور اصحاب تحریف کی طرف سے بارہا ہوتی ہے سو ہمیشہ کلام کو اس کی صحیح سمت سے ہٹا کر، جس وادی میں چاہا اسے گھسیٹتے پھرتے ہیں۔ انہیں اگر کسی چیز سے چڑ رہی ہے تو نظم کلام سے۔ ایک مشہور مترجم قرآن، سورہ احزاب آیت ۳۳ کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں " اگر اس آیت کو یہاں سے نکال لو اور ماقبل اور مابعد کو ملا کر پڑھو تو کوئی خرابی نہیں ہوتی بلکہ اور ربط بڑھ جاتا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ

آیت اس مقام کی نہیں بلکہ خواہ مخواہ کسی خاص غرض سے داخل کی گئی ہے" جناب مترجم نے پہلے تو آیت کی من مانی تاویل کر ڈالی اور چند حسب منشا روایات کا حوالہ دے کر اطمینان کا سانس لے لیا۔ پھر انہیں احساس ہوا کہ نظم کلام ان کا ساتھ نہیں دیتا تو جھٹ سے بے نظمی کی شکایت کر دی اور جامعین قرآن پر برس پڑے۔ ان حالات میں ساری امت کو ایک ہی جھنڈے کے نیچے جمع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نظم کلام ظاہر کیا جائے اور ہر سورہ کا مرکزی مضمون سب کے سامنے رہے تبھی کلام کا صحیح رخ متعین ہو سکے گا اور اسی سے اصحاب تحریف اور اہل بدعت کی کجرویوں کی اصلاح کی جا سکے گی اور ان کی غلط تاویلوں اور تحریفوں سے کلام الٰہی کو محفوظ رکھا جا سکے گا اور کیا عجب کہ نظم سمیت پورے قرآن کو محفوظ کر کے ہم اس عداوت اور بغضاء سے بھی بچ نکلیں جس کا سامنا سابقہ امتوں کو ذکر اور یاد دہانی کے ایک حصے کو بھلا دینے سے کرنا پڑا تھا۔

اگر نظم اور نظام کی اہمیت یہی ہے تو ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ خود قرآن مجید میں اس کے ثبوت اور شواہد کہاں تک ملتے ہیں۔ امام فراہیؒ اس کے لئے، دوسری آیات کے علاوہ سورہ قیامہ کی آیات ۱۷ تا ۱۹ کو پیش کرتے ہیں۔

ان علینا جمعہ و قرآنہ	ہمارا ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو سنانا،
فاذا قرانٰہ فاتبع قرآنہ	پس جب ہم اس کو سنا دیں تو اس کی پیروی کر۔
ثم ان علینا بیانہ ٥	پھر ہمارے ذمے ہے اس کی تفصیل۔

قرآن مجید کو تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنے میں تو قرآن کے اوّلین مخاطبوں کی رعایت ملحوظ تھی تاکہ فہم و رسوخ میں آسانی ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ اسے جمع کرے گا اور جمع کرنے کے بعد اسے سنائے گا۔ پھر رسول اکرمؐ کو یہ ہدایت فرمائی کہ جس طرح سے اسے سنایا جائے، اس کی پیروی کریں چنانچہ ایسا ہی ہوا اور احادیث و آثار سے اسی کی تصدیق ہوتی ہے۔ صحابہ کرام نے اپنے استنباط سے آیتوں کو آگے پیچھے جوڑ کر سورتیں نہیں بنائیں بلکہ وحی الٰہی کے مطابق خود حضورؐ کے جمع کردہ قرآن مجید کو محفوظ کر دیا اور یہ کام اس شان اور اہتمام کے ساتھ کیا کہ کسی کو اس سے الگ ہٹ کر اپنی مزعومہ ترتیب پر اصرار کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

اگر مصحف کی موجودہ ترتیب وحی الٰہی کے مطابق ہے جیسا کہ درحقیقت ہے بھی، تو یہاں اس کی حکمت پر غور کرنا چاہیئے۔ اگر ہر سورہ اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتی تو آخر قرآن مجید کی تقسیم ۱۱۴ سورتوں میں کیوں کی گئی؟ یہ حد بندی اور چھوٹی بڑی سورتوں کی موجودہ ترتیب صاف بتاتی ہے کہ ہر

سورہ ایک وحدت ہے اور یہ ہمارا کام ہے کہ اُس کی تہ میں اتر کر اس کا نظم دریافت کرنے کی کوشش کریں۔ چھوٹی اور متوسط سورتوں کی ابتدا کو لیجئے یا خاتمے کو، آپ کا دل گواہی دے گا کہ یہ ابتدا ہے اور یہ خاتمہ، پھر متن کو دیکھئے۔ بسا اوقات ظاہری اسلوب اور قافیے کی رعایت تک پکار کر کہتی ہے کہ یہ سورہ ایک وحدت ہے۔ ترجیع والی سورتوں کی وحدت بھلا کس سے مخفی رہ سکتی ہے۔ اب اگر ہم خود سورہ میں ڈوب کر اُس کی وحدتِ معنی تک نہ پہنچ سکیں تو اس میں قصور کس کا ہے؟ رہیں بڑی سورتیں تو اگر ہمارا پہلا قدم ہی اس سوءِ ظن کے ساتھ نہ اٹھے کہ آگے پیچھے اترنے والی آیات بغیر کسی نظم و ترتیب کے آپس میں جوڑ دی گئی ہیں تو آخر اس بات کی کہاں گنجائش ہے کہ کسی سورہ کو ہم ایک سے زیادہ الگ اور بے جوڑ ٹکڑوں یا خطبوں کا مجموعہ مانیں۔ یہی بات تھی تو اسے ایک سورہ کا روپ دیا ہی کیوں گیا تھا؟ کیوں نہ ایک سے زیادہ سورتیں بنا دی گئیں؟

اگر نظم کا علم اس اہمیت کا مالک اور ان فوائد کا حامل تھا تو پھر آخر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی توضیح کیوں نہیں فرمائی؟ اور صحابہؓ نے اس کے بارے میں کیوں سکوت اختیار کیا؟ امام فراہیؒ کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ آیات کا موقع و محل صحابہؓ کے سامنے بالکل واضح تھا۔ وہ تمام تر انہی کے حالات اور انہی کے پیشِ نظر معاملات سے متعلق تھیں ... زبان اُن کی تھی، اسلوب اُن کے تھے معاملات و حالات اُن کے تھے۔" یعنی اگر ہم بھی اس مبارک زمانے میں ہوتے تو اُن کا نظم ہمارے لئے بھی بالکل واضح ہوتا اور ایک واضح بات کی توضیح تحصیلِ حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ سے تفسیر بہت کم منقول ہے۔ پھر نقل کرنے کا مقبول طریقہ بھی یہ رہا ہے کہ ایک ایک آیت کے تحت صحابہؓ اور تابعین کے اقوال درج کئے جاتے ہیں۔ اس طرح کسی ایک صحابی یا تابعی سے کسی سورہ کی مبسوط تفسیر مرتب نہ ہو سکی جس سے یہ واضح ہو سکتا کہ اس کا نظم ان پہ خوب عیاں تھا۔

بعد کے ادوار میں نظام سے بے اعتنائی کے چند در چند اسباب تھے جن میں سے سب سے قوی اللہ کے کلام کو ہر عیب اور ہر خامی سے بری قرار دینے کی خواہش ہے۔ ہر چند قرآن کا نظام و ترتیب بہت سے مقامات پہ بالکل ظاہر ہے مگر اصحابِ تفسیر کے لئے یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ سارے کا سارا منظم ہے اور ہر جگہ اس میں نظم کی رعایت ملحوظ ہے کیونکہ چند مقامات ایسے بھی تھے جہاں خود ان پہ نظم واضح نہ تھا لہٰذا انہوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ نظم کا سرے سے انکار کر دیا جائے۔ دوسرا سبب یہ ہوا کہ خود نظم کے مدعیوں کی طرف سے ایسا کمزور اور پھسپھسا نظم پیش کیا گیا جو کسی منصف مزاج شخص کو اس کا معترف نہ بنا سکا بلکہ الٹا ان کی مایوسی اور انکار کا سبب بن کر رہ گیا۔ تیسرا سبب اقوال کی کثرت، تاویل کی گوناگونی اور جدل و جدال

ہے کیونکہ نظم صرف ایک ہی تاویل کا متحمل ہو سکتا ہے اس لئے یہ ان لوگوں پر واضح نہ ہو سکا جنہیں اقوال کے بحرِ بیکراں کو محفوظ کرنے کی ہوس ہوئی۔ چوتھا سبب یہ ہوا کہ امت گروہوں میں بٹ گئی اور ہر گروہ اور ہر فرقے کو قرآن کی تاویل میں اپنے مسلک کی تائید ہی منظور رہی خواہ اس کی خاطر کلام کو اس کے صحیح رخ سے موڑنے کے لئے کیسی ہی دیدہ دلیری سے کیوں نہ کام لینا پڑے۔

روایات کا ذکر چھڑا ہے تو چند حرف شانِ نزول کے بارے میں بھی سن لیجئے۔ کیونکہ نظم سے وحشت پیدا کرنے میں انہی روایات کا سب سے زیادہ دخل ہے اس لئے کہ عام لوگ اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ ایک مخصوص واقعہ کسی آیت یا مجموعہ آیات کے نزول کا سبب بنا۔ حالانکہ وہ آیت سے ایک قسم کا استدلال ہوتا ہے کہ وہ اس حکم پر مشتمل ہے یا ان حالات پر بھی منطبق ہوتی ہے حتیٰ کہ یہ بھی ضروری نہیں ہوتا کہ ایک آیت اسی زمانے میں نازل ہوئی ہو جس زمانہ میں وہ واقعہ پیش آیا۔ علامہ زرکشیؒ نے البرہان فی علوم القرآن میں اس کی تصریح کی ہے اور اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ اس امر پر اتفاق کے بعد کہ ایک سورہ بیک وقت نازل ہوئی تھی اس کی ہر آیت کا الگ الگ شانِ نزول بھی بیان کر دیا جاتا ہے۔ مزید وضاحت کے لئے متاخرین کا تفسیری کارنامہ ملاحظہ ہو۔ ساتویں صدی ہجری کے ایک معروف شیخِ طریقت واذا قیل لھم لا تفسدوا فی الارض کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں " ای لا تُشَکِّکُوا اولیاء اللہ وَلَا تُشَوِّشُوا قلوب المریدین بغیبۃ شیوخھم عندھم ولا تاخذھم الی نھکۃ الفراق قنطرۃ النفاق " عہدِ حاضر کے ایک مفسر جو انگریزی زبان میں قرآن کی ایک مبسوط تفسیر کے مصنف ہیں غیر المغضوب علیھم سے یہود مراد لینے کے بعد لکھتے ہیں :-

> "Those who brought the person whom god has made next only to the holy prophet in all accomplishments to the fourth position in the panel made by man for disciples of the holy prophet are surely falling short of the order as the jews"

ظاہر ہے کہ قرآن کے نزول کے وقت نہ مرید اور شیخ کے جھگڑے تھے اور نہ خلافتِ رسول اللہ ﷺ کا قضیہ تھا۔ چنانچہ جن بزرگوں سے یہ تفسیر منقول ہے ان کا بھی یہ دعویٰ نہیں ہو سکتا کہ بعینہٖ یہی معاملات قرآن کی ان آیات کے نزول کا سبب بنے تھے بلکہ یہ ایک طرح سے بعد میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں

دقیق کا حسنِ استنباط ہے۔ بہرحال شانِ نزول والی روایات سے کسی قسم کی وحشت نہ ہونی چاہیے۔

امام فراہیؒ کے بنیادی اصولِ تفسیر یعنی نظمِ قرآن کے بارے میں اسی پہ اکتفا کرتا ہوں۔ جو لوگ نظم کے شواہد اور دلائل، اس کی تلاش کے لئے رہبر اصولوں اور اس راہ میں امام فراہیؒ کی کامیاب کوششوں کے بارے میں مزید تفصیل کے طالب ہوں انہیں میں مشورہ دوں گا کہ وہ ان کی عربی تصنیف "دلائل النظام" اور اُن کی تفسیر کے مطبوعہ اجزا کا بالاستیعاب مطالعہ کریں۔

اب ہم امام فراہیؒ کے دوسرے اصول "تاویل الآیات بالآیات" کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ اصول اپنی جگہ بہت قدیم ہے اور اس کے شواہد بھی قرآن میں بکثرت ہیں۔ کتابِ الٰہی میں اس بات کی تصریح بھی کی گئی ہے کہ جو امر ایک جگہ اجمال کے ساتھ بیان ہوا ہے اسی کی تفصیل کسی دوسری جگہ کر دی گئی ہے۔ اگرچہ یہ اصول بہت راسخ مانا جاتا ہے تاہم تفسیر کے میدان میں اس کا استعمال بہت کم ہوا ہے جس کے متعدد اسباب ہیں، اُن میں سے سب سے بڑا سبب تفسیر بالرائے سے بچنے کی خواہش ہے جو بذاتِ خود بہت محمود ہے۔ لیکن تفسیر بالرائے سے مراد کیا ہے؟ عام طور پہ اس سے ہر وہ تفسیر مراد لی جاتی ہے جو سلف سے منقول نہ ہو۔ چنانچہ قرآن کی تفسیر کے لئے خود قرآن مجید سے رجوع کرنے کی بجائے لوگوں نے سلف کے اقوال کی طرف رجوع کرنا ضروری قرار دیا اور اس اصول پہ یہاں تک اصرار کیا کہ کمزور اور ضعیف، ایک دوسرے سے متناقض بلکہ خود قرآن سے متناقض روایات کو بھی ایک درجہ ترجیح کا مل گیا۔ حالانکہ روایات میں سے صحیح اور سقیم میں فرق کئے بغیر اُن پر یکساں اعتماد کی قطعاً گنجائش نہیں۔ روایت اور درایت کے اصولوں پہ ان تفسیری روایات کی جانچ پرکھ کے بعد اُن میں سے صحیح اور ثابت شدہ روایات چھانٹ لی جانی چاہیئں۔ اور اُن کے بارے میں بھی یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان میں مرفوع روایات کی تعداد بہت کم ہے اور صحابہؓ اور تابعین رحمہم اللہ کی تاویلات کا ماخذ عربی زبان، آیاتِ قرآنی کے نظائر، سنت اور خداداد بصیرت تھی اسی لئے ظاہری اختلاف کے باوصف تأمل کار کے پہلو سے ان میں اک گونہ قرب اور اشتراک پایا جاتا ہے اور اُن کا اس تفسیر بالرائے سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں تھا جس کے لئے قرآن، سنت اور لسانِ عرب میں کوئی سند نہ ہو۔ یہ حرکت بعد کے ادوار میں بدعت اور ضلالت کے علمبرداروں اور گمراہ فرقوں کے بانیوں نے کی کہ قرآن کے الفاظ کو وہ معنی پہنائے جن کے لئے قرآن میں کوئی نظیر نہ ہو۔ نظم جن سے اباء کرتا ہو، اور عربی زبان میں جن کے لئے کوئی سند نہ ہو۔ اسی کی خاطر انہوں نے بسا اوقات روایات بھی گھڑیں اور انہیں وسیع پیمانے پہ شائع بھی کیا لیکن ان کی تفسیر تفسیر بالرائے ہی رہی اگرچہ اس کے لئے وہ بیسیوں وضعی روایات کو پیش کرنے میں کامیاب رہے۔

امام فراہیؒ تفسیر آیات بالآیات کے اصول کو نظری طور پر ہی نہیں مانتے بلکہ عملاً بھی اسے ہر جگہ اپناتے ہیں۔ ان کے نزدیک اصحاب تحریف کی معندہ کاریوں کے نتیجے کا یہ کوئی کارگر نسخہ نہیں کہ قرآن مجید کو نظر انداز کر کے روایات کا التزام کیا جائے۔ قرآن بہر حال زیادہ قابل اعتماد ہے اور تمسک بالقرآن ہی سب سے محفوظ و مامون راستہ ہے۔ اصحاب تحریف کا منہ توڑنے کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ تاویل کے صحیح اصول دریافت کئے جائیں اور ان کی صحت و صداقت کو اس حد تک ثابت کر دیا جائے کہ اصحاب تحریف کے لئے من مانی تاویلیں پیش کرنے کی گنجائش نہ رہ جائے۔ امام فراہیؒ نے تاویل کے چند اصول قائم کئے ہیں جن میں سے چار اس صورت کے لئے ہیں کہ ایک سے زیادہ معانی کا احتمال نہ ہو اور پانچ اس حالت کے لئے کہ ایک سے زیادہ معانی کا احتمال ہو اور راجح معنی کو اختیار کرنے اور مرجوح کو چھوڑ دینے کا سوال پیدا ہو۔ پہلے چار میں کلام[1] کے نظم اور سیاق و سباق کا لحاظ، شاذ[2] معنی کو نظر انداز کرنا، تاویل[3] بالقرآن یا دوسرے لفظوں میں ایک حصے کی تاویل، مقابلے اور نظیر کے اصولوں پر دوسرے حصے کی مدد سے کرنا اور مخاطب[4] کا لحاظ شامل ہیں۔

ترجیحی اصول یہ ہیں۔ اس پہلو یا تعبیر کو اختیار کرنا جو اپنے مقام اور عمود کلام سے زیادہ موافق ہو اور جس کے لئے باقی قرآن میں نظیر موجود ہو۔ اسی طرح ایک معنی اگر اس عبارت سے کچھ مختلف عبارت کا تقاضا کرتا ہو جو کلام میں فی الواقع موجود ہے تو وہ مرجوح قرار پائے گا راجح نہیں، چوتھا اور پانچواں اصول احسن اور لغت کے اعتبار سے ثابت ترین پہلو کا اختیار کرنا ہیں۔

امام فراہیؒ کی تفسیر آیات بالآیات کے اصول کو کیونکہ برتتے ہیں۔ یہ جاننے کے لئے چند مثالیں سامنے رکھیے۔ سورہ انفال کے اواخر میں آیا ہے ان الذین امنوا و ھاجروا و جاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ۔ کچھ اور آگے جا کر آتا ہے والذین امنوا و ھاجروا و جاھدوا فی سبیل اللہ جس میں باموالھم و انفسھم کا مذکور نہیں تاہم یہ مفہوم موجود ہے۔ پھر کچھ اور آگے جا کر یہ الفاظ ملیں گے والذین امنوا من بعد و ھاجروا و جاھدوا معکم۔ یہاں فی سبیل اللہ کا ذکر نہیں اور نہ باموالھم و انفسھم ہی کا ہے لیکن یہ مفہوم موجود ہے اور "معکم" کے الفاظ اس پر دلیل ہیں۔ یہ تو مجمل اور مفصل کی مثال تھی۔ اب ذرا مقابلے کی مثال لیجئے۔ سورہ بقرہ کے اوائل میں آیا ہے ان الذین کفروا سواءٌ علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یومنون۔ ختم اللہ علی قلوبھم و علی سمعھم و علی ابصارھم غشاوۃٌ ولھم عذابٌ عظیم۔ یہاں الذین کفروا سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کی صفات عدل کا کفر کیا اور بنا بریں جزاء کا کفر کیا۔ لا یومنون سے مراد یہ ہے کہ وہ ایمان لانے والے اور اس کتاب سے ہدایت پانے والے نہیں بنیں گے۔ یہ

مفہوم ہم اس سے مراد لیں گے کہ اس سے پہلے یہ قول گزر چکا ہے ذالک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین الذین یومنون بالغیب (یعنی شہود سے قبل ایمان لاتے ہیں) تو جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی وہ لازماً ان کی ضد ہوں گے۔ اسی طرح مومنین کی صفات کے ذکر کے بعد کہا گیا تھا اولئک علی ھدی من ربھم و اولئک ھم المفلحون۔ اور اب ان لوگوں کا ذکر ہوا جن کی راہ مومنین کی راہ کے مخالف ہے۔ امام فراہیؒ کو جس چیز نے اس تاویل کے اختیار کرنے پر اُبھارا وہ مبتدا اور خبر یعنی الذین کفروا اور لایومنون میں فرق کا نہ ہونا تھا۔ حالانکہ فرق ہونا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے سیاق کلام پر نگاہ کی اور صحیح مفہوم ان پر منکشف ہو گیا۔ پھر انہوں نے اس کے نظائر کی جستجو کی اور اوائل سورۂ یٰسین میں انہیں نظیر بھی مل گئی۔ اس دوسری مثال سے خاص طور پر آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ تفسیر آیات بالآیات کے اصول نے کس طرح وہ گتھیاں امام فراہیؒ سے سلجھا دیں جن میں دوسرے الجھ کر رہ گئے تھے۔

امام فراہیؒ مفردات، اسالیب، نحو، استدلال، بیان سب کے لئے قرآن ہی کو سند کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ قرآن ہی کے اسلوب کو سب سے اعلیٰ اور اصل اسلوب مانتے ہیں۔ وہ قرآن کی زبان ہی کو معیاری زبان مانتے ہیں۔ وہ قرآن کی قطع و برید کر کے اس پر نحو، لغت، بیان اور منطق کا حاکم حیثیت کرنے کے قائل نہیں، وہ لغت کی کتابوں پر قانع لوگوں کو کلام عرب میں مہارت بہم پہنچانے کا مشورہ دیتے ہیں یہاں تک کہ وہ ایک ماہر ناقد کی طرح اُس کے اصل اور نقل میں امتیاز کر کے اصل کلام عرب سے استنباد کرنے کے قابل ہو جائیں، وہ بلاغت میں باقلانیؒ کی اعجاز القرآن پر اکتفا یا محض اشعار پر اعتماد کرنے والوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ قرآن، انبیاء علیہم السلام کی وحی اور خطیبوں کے کلام کی طرف رجوع کریں جہاں انہیں حسنِ استدلال کے گوناگوں پہلو، ربطِ معانی کے مختلف انداز، ضرب الامثال کے مختلف طریقے، قصص سے عبرت پذیری کے مختلف ڈھنگ، کلام کا بڑھ کر اپنے مرکز کی طرف لوٹنا، زجر اور عتاب، متکلم کی شدتِ یقین کا اظہار، شریفانہ اعراض، ناصحانہ اظہار حسرت اور خطاب کے عجائب تصرفات ملیں گے۔

اب آیئے قرآن مجید کی اصطلاحات کی طرف، جن میں صلوٰۃ، زکوٰۃ، جہاد، صوم، حج، مسجد حرام، صفا، مروہ اور مناسک حج وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب کی عملی شکل تواتر و توارث کے ساتھ، سلف سے لے کر خلف تک محفوظ رہی ہے اور ان میں جو معمولی جزئی اختلافات نظر آتے ہیں وہ بالکل ناقابل لحاظ ہیں اور اپنی بنیادی ہئیت میں وہ ہم تک اسی تواتر سے پہنچے ہیں جس تواتر سے خود قرآن پہنچا ہے۔ چنانچہ ایسے اصطلاحی الفاظ کے معاملے میں جن کی پوری تعریف اور تصویر قرآن میں بیان نہیں ہوئی، صحیح راہِ عمل امام فراہیؒ کے نزدیک یہ ہے کہ جتنے حصے پر تمام اُمت متفق ہو اتنے پر قناعت کی جائے۔ ان اصطلاحات میں سے مثال

کے طور پر حج کو لے لیجیے۔ ان دو ایک سالوں کو چھوڑ کر جب ایک بدبخت گروہ نے بزورِ شمشیر مسلمانوں کو حج سے روک دیا تھا، اس کے تمام مناسک اپنے تواترِ عملی کے ساتھ سال بسال دہرائے گئے ہیں اور اسی طرح ہم تک پہنچے ہیں۔ یہی حال دوسری سنن متواترہ کا ہے۔

امام فراہیؒ تفسیری روایات کو نظر انداز کرنے کے قائل نہیں تھے۔ وہ کہتے ہیں "پہلی چیز جو قرآن کی تفسیر میں مرجع کا کام دے سکتی ہے وہ خود قرآن ہے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا فہم ہے۔ پس میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے سب سے زیادہ پسند وہی تفسیر ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہو۔" انہیں اس بات کا بھی یقین تھا کہ صحیح احادیث اور قرآن میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ ان کا طریقہ، روایات کو بطور اصل کے پیش کرنے کا نہیں بلکہ بطور تائید کے پیش کرنے کا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ پہلے ایک آیت کی تاویل اس کی ہم معنی دوسری آیات سے کرتا ہوں، اس کے بعد تبعاً اس سے متعلق صحیح احادیث کا ذکر کرتا ہوں تاکہ نہ تو ان منکرین ہی کو کسی اعتراض کا موقع ملے جنہوں نے قرآن کو پس پشت ڈال رکھا ہے اور نہ وہ ملحدین ہی کوئی اعتراض اٹھا سکیں جو ہمارے سر ایسی چیزیں تھوپتے ہیں جن کی قرآن میں کوئی اصل نہیں۔" لیکن ایسی روایات کو وہ بہرحال نہ لیتے تھے جو اصل کو ڈھانے والی ہوں یا نصوصِ قرآنی کی تکذیب کرنے والی ہوں۔ اسی طرح وہ یہ بھی نہیں مانتے تھے کہ کوئی متواتر خبر بھی کسی صورت میں قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ ایسی خبر کی یا تو تاویل کریں گے یا اس میں توقف کریں گے۔ لیکن اس کی خاطر قرآن کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ان تمام روایتوں کو وہ قبول کرتے تھے جو قرآن کی تصدیق و تائید کرتی ہوں، مثلاً جو آثار حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہیں، ان کے بارے میں امام فراہیؒ کی رائے یہ تھی کہ "وہ بالعموم نظم قرآن سے بہت اقرب ہیں۔"

قوموں کی ثابت شدہ تاریخ اور قدیم آسمانی صحیفے بھی قرآن کی تفسیر میں کام آتے ہیں۔ مگر اس طرح کہ قرآن کا بیان قطعی اور فیصلہ کن مانا جائے۔ وہ اپنی تصحیح اور تکمیل کے لئے قرآن کے محتاج ہیں نہ کہ قرآن ان کا۔ قرآن ان پر مہیمن ہے نہ کہ وہ قرآن پر۔ البتہ قرآن کے بہت سے اشارات کو سمجھنے میں وہ مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ امام فراہیؒ فرماتے ہیں "یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ قرآن مجید اپنی تفسیر کے لئے ان فروع کا محتاج نہیں ہے۔ وہ تمام کتابوں کے لئے خود مرکز و مرجع کی حیثیت رکھتا ہے اور جہاں کہیں اختلاف واقع ہو تو اس کی روشنی جھگڑے کو چکانے والی بنے گی۔" ایک اور حقیقت کی طرف بھی امام فراہیؒ نے اشارہ کیا ہے کہ "قرآن سے جو کچھ ثابت ہو اس میں اور فروع سے جو کچھ ثابت ہو اس میں فرق کرنا چاہیئے۔ دونوں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ قرآن میں جو کچھ ہے، وہ

قطعی ثابت ہے اور فروع میں وہم و ظن کے لئے بہت کچھ گنجائش ہے۔"

تفسیر آیات بالآیات کے اصول کی مزید توضیح کے لئے "التکمیل فی اصول التاویل" دیکھنی چاہیئے جس میں امام فراہیؒ نے اصول تاویل کو مدون اور مرتب کیا ہے۔ مجموعہ تفاسیر فراہیؒ بھی اُن کے اصولِ تفسیر یعنی نظم قرآن اور تفسیر آیات بالآیات کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ نیز مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی متعدد تصنیفوں میں ان اصولوں کی مزید توضیح بھی کی ہے اور انہی اصولوں پر اپنی تفسیر تدبر قرآن کی بنیاد بھی رکھی ہے۔ امام فراہیؒ کے اصول تفسیر کے بارے میں اپنی معروضات کو میں اُن کے مقدمہ تفسیر کے ابتدائی کلمات پر ختم کرتا ہوں۔ "اللہ تعالیٰ کی توفیق و عنایت سے میں نے اپنی تفسیر نظام القرآن میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ آیاتِ قرآن کے باہمی تعلق کو واضح کروں اور قرآن مجید کی ایک ایسی سادہ و صاف تفسیر لکھوں جو ان تمام اختلافات سے بالکل پاک ہو جو ہمارے اندر عہد نبوت کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ میں نے ہر آیت کا مفہوم اُس کی مشابہ دوسری آیات کی روشنی میں متعین کیا ہے اور ہر سورت کے نظام کو اُس کی تہ میں اتر کر اور اس کے سیاق کو سمجھ کر معلوم کرنے کی کوشش کی ہے پھر اس جد و جہد میں جو کچھ سمجھ میں آیا ہے اُس کو عقل و نقل سے پوری طرح مدلل کیا ہے۔"

"تدبر قرآن" کے ایک قاری کا تاثر

سوہدرہ ۱۶ فروری ۱۹۷۴ء محترم المقام حضرت مولانا مدظلہ العالی

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ آپ کی تفسیر تدبر قرآن اور مجموعہ تفاسیر فراہی آجکل زیر مطالعہ ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی اور صحت عطا فرمائے تاکہ آپ قرآن مجید کی مکمل تفسیر کر سکیں۔

آپ جس طرح قرآن پاک کی تفسیر کرتے ہیں مطالعہ کرتے وقت ہر لفظ ذہن میں اترتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی آپ کے حق میں دعائے خیر نکلتی ہے۔ آپ جس طرح اسلام کی خدمت کر رہے ہیں شاید ہی اور کوئی آپ کے مقابل اترے۔

آپ نے تفسیر کتنے پاروں تک مکمل کر لی ہے؟ اس بارے میں اگر آپ مطلع کر سکیں تو آپ کی نوازش ہوگی۔ اس کے علاوہ "میثاق" کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ امام حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی دو کتابیں — اقسام القرآن اور الرای الصحیح فی من ہو الذبیح — بھی آپ کے ترجمہ سے شائع ہو رہی ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی دے اور صحت دے کہ آپ امام فراہی کی احکام الاصول باحکام الرسول اور اسباب النزول کا بھی ترجمہ کر کے شائع کرا دیں۔ دعاگو

عبدالرشید عراقی بمقام سوہدرہ براستہ وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ

فہرست مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

تصنیف امام حمید الدین فراہی رح

★ مجموعہ تفاسیر فراہی رح — ہدیہ -/۲۴

تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

★ سلسلۂ تدبر قرآن :

- مبادیٔ تدبر قرآن : تدبر قرآن کے اصول و قواعد پر اہم دستاویز — ہدیہ -/۶
- مقدمہ تدبر قرآن و تفاسیر آیت بسم اللہ و سورۂ فاتحہ — ہدیہ -/۲
- تدبر قرآن جلد اول مشتمل بر مقدمہ و تفسیر از ابتداء تا سورۂ آل عمران ہدیہ -/۴۰
- تدبر قرآن جلد دوم مشتمل بر تفسیر سورۂ نساء تا سورۂ اعراف — -/۳۲
- تدبر قرآن جلد سوم مشتمل بر تفسیر سورۂ انفال تا سورۂ بنی اسرائیل — -/۴۰

★ حقیقت دین : مشتمل بر حقیقت شرک ، حقیقت توحید ، حقیقت تقویٰ اور حقیقت نماز — -/۱۲

★ دعوت دین اور اس کا طریق کار — -/۵

★ اقامت دین کے لئے انبیاء کرام کا طریق کار — -/۵۰

★ قرآن اور پردہ — -/۶۰

تصانیف ڈاکٹر اسرار احمد

★ تحریک جماعت اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ — -/۴

★ اسلام کی نشاۃ ثانیہ : کرنے کا اصل کام — -/۵۰

★ مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق — -/۱

★ WHAT DO THE MUSLIMS OWE TO THE QURAN — -/۱۵۰

★ راہ نجات : سورۂ والعصر کی روشنی میں — ادنیٰ -/۴۰ اعلیٰ -/۱

★ قرآن اور امن عالم — -/۵۰

تالیف ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

★ اسلامی تحقیق کا مفہوم ، مدعا اور طریق کار — اعلیٰ -/۱۵۰ ادنیٰ -/۱

——(محصول ڈاک ان قیمتوں کے علاوہ !)——

Regd. No. L. 7360

Monthly **"MEESAAQ"** *Lahore*

Vol. 21 | MARCH 1974 | No. 3

مرکزی **انجمن خدام القرآن** لاهور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان ــــ اور ــــ سرچشمۂ یقین

قرآن حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے ــــ اور ــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اِسلام کی نشأۃِ ثانیہ ــ اور ــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

پبلشر : محی الدین ، طابع : شیخ محمد اشرف مالک اشرف بریس ایبک روڈ ۔ لاہور
مقام اشاعت : کوثر روڈ ، اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور